ہمارا خالق
محمد ضیاء اللہ

ہمارا خالق

محمد ضیاء اللہ

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز
لاہور ○ حیدرآباد ○ کراچی

اِس درجہ ترقی خاک کو دی
وہ ہوش میں آکر شوق بنی
اِس شوق کا خود منظورِ نظر
سُبحان اللہ سُبحان اللہ

دیباچہ

دنیا کی گہما گہمی اور دلچسپیوں میں منہمک غافل انسان کو بھلا کب فرصت ہے کہ وہ اس بات پر غور کرے کہ وہ کیا ہے، کہاں سے آیا ہے، کدھر جا رہا ہے، کس نے اس کو اس عالمِ کون و مکان میں بھیجا ہے اور کس مقصد کے لیے بھیجا ہے، لیکن اگر وہ اپنی تنہائی کے چند لمحات میں ان سوالات پر غور کرلے تو یہ بات آسانی سے اس کی سمجھ میں آجائے گی کہ یہ غور و خوض اس کے اپنے ہی فائدہ میں ہے۔

اس بات کا تو ہر انسان کو بخوبی علم ہے کہ نہ تو وہ خود اس دُنیا میں آیا ہے اور نہ ہی اپنی مرضی سے یہاں سے جائے گا بلکہ اس کا آنا اور جانا دونوں ہی کسی اور کے حکم کے تابع ہے اس لیے جس ذاتِ توانا نے اسے یہاں بھیجا ہے اس سے غفلت اور مقصدِ حیات سے بے اعتنائی اس کے لیے نقصان کا باعث ہوگی۔ اس کے برعکس اگر وہ اپنے خالق سے آگاہی حاصل کرکے زندگی اس کی منشا کے مطابق گزارتا ہے تو یہ اس کے لیے سلامتی کا راستہ ہوگا اور ہر سمجھ دار انسان سلامتی کا راستہ ہی اختیار کرتا ہے اور اسلام انسان کو اسی سلامتی کے راستہ کی طرف بُلاتا ہے جس کا مرکزی نقطہ خدائے برتر کی ذات یگانا اور اسی سے تعلّق ہے چنانچہ اس مختصر کتاب میں اس بنیادی مضمون کو اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور اس بات کو خاص طور سے مدّنظر رکھا گیا ہے کہ بات بالکل صاف سیدھی اور واضح ہو اور استدلال ایسا کہ کوئی سلیم العقل اور نیک

فطرت انسان اس سے اختلاف نہ کر سکے اور پھر بات بھی دل پر اثر کرنے والی ہو کیوں کہ سب انسان مختلف خیال رکھنے کے باوجود اپنی اصلیت اور حقیقت میں ایک ہیں اور اپنے سینے میں ایک سا ہی دل رکھتے ہیں اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اگر مؤثر بات کی جائے تو وہ قاری کے دل کی گہرائیوں میں نہ اُتر جائے۔

قرآنِ پاک نے ہمارے خالق کا یہ تصور پیش کیا ہے کہ وہ نہایت مہربان، حد سے زیادہ کریم اور بے انتہا قدرتوں کا مالک ہے۔ اس نے ہم کو محض ہم پر کرم کرنے کی خاطر پیدا کیا ہے۔ وہ اس بات سے پاک ہے کہ ہماری تخلیق سے اس کا اپنا کوئی مفاد وابستہ ہو ظاہر ہے کہ جو ذات غنی اور ہر شے سے بے نیاز ہو اسے بھلا ہم خاک کے پتلوں اور ان کے اعمال کی کیا حاجت ہو سکتی ہے؟ اپنی صفت خالقیت کے ماتحت وہ ہم کو نیست سے ہست کر کے اور اپنی ربوبیت کی جلوہ گری سے ادنیٰ سے اعلیٰ یعنی خود اپنی ہی ذات کی طرف لے جا رہا ہے۔ قرآنِ پاک میں بہت صراحت سے اس مضمون کو واضح کیا گیا ہے۔ منجملہ دیگر آیاتِ قرآنی یہ چند آیات اس سلسلہ میں بہت قطعی ہیں۔ ثم الی ربکم مرجعکم (انعام - ۱۶۵) والی اللہ المصیر (آلِ عمران - ۲۸) ثم الی ربکم ترجعون (سجدہ - ۱۲) ان الیہ راجعون (بقرہ - ۱۵۶) انھم ملٰقوا ربھم وانھم الیہ راجعون (بقرہ - ۴۶-۴۷) یایھا الانسان انک کادح الی ربک کدحاً فملٰقیہ (انشقاق - ۶)

کچھ ارتقائی منازل ہم طے کر آئے ہیں۔ کیا ایک وقت میں ہم ان عناصر کی منازل میں نہ تھے کہ جن سے ہم مرکب ہیں؟ اور ہماری ہر آنے والی منزل پہلی سے ارفع ہے۔

کیا جنین کے مقابلہ میں ہماری یہ موجودہ شعور سے بہرہ ور زندگی اعلیٰ نہیں؟ اور ارتقا کا یہ پُرحکمت اور کریمانہ سلسلہ اسی طرح چلا جائے گا۔ کیونکہ جب "منزلِ ماکبریاست" ٹھہری تو پھر ہماری ترقی کے ختم ہونے کا کیا سوال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حیاتِ اُخروی کی ترقیات لامتناہی ہیں۔

ہم کو معرضِ وجود میں لاکر اور اپنی معرفت کے لیے ہم کو نورِ عقل بخش کر ہمارا مہربان خالق یہ چاہتا ہے کہ اس کی ذات کی طرف ہماری رجعت اس کے بتائے ہوئے راستہ پر جاری رہے اور یہ راستہ کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ راستہ اعمالِ حسنہ کی بجا آوری اور اعمالِ سیئہ سے اجتناب کا راستہ ہے۔ ہمارا خالق محض خیر ہے اس لیے اچھے اعمال اس کو پسند ہیں اور ہمیں اس کے قریب لے جاتے ہیں۔ بدی سے ہمارے خالق کو نفرت ہے اس لیے بُرے اعمال ہم کو اس سے دُور لے جاتے ہیں اور قرآنِ پاک میں بیان فرمودہ تمام اوامر و نواہی انھی اچھے اور بُرے اعمال کی تفاصیل ہیں تاکہ ان پر عمل پیرا ہو کر ہم اپنے مقصدِ حیات کو پا سکیں۔ جو لوگ ان احکامات کو ایک طرح کی چٹّی یا تاوان خیال کرتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں۔ ان احکامات کی غرض حقیقت میں انسان کی اپنی ہی ترقی اور بہتری کے سوا اور کچھ نہیں۔ کیا انسان کا علم حاصل کرنا خود اس کی اپنی بہتری کا باعث نہیں بنتا؟

پھر ہمارے مہربان خالق نے ہماری فطرت میں نیکی اور بدی کی قوّتِ تمیز بھی ودیعت کر دی ہے جیسے کہ وہ قرآنِ پاک میں فرماتا ہے: فالھمھا فجورھا وتقواھا (الشمس - ۸) یعنی ہمیں ضمیر یا کانشنس دے دیا گیا ہے (جس سے

ہم سب بخوبی آگاہ ہیں) تاہم اس کی مدد سے نیکی اور بدی میں تمیز کر کے کامیابی سے اپنی منزلِ کی طرف زندگی کا سفر جاری رکھ سکیں۔ اس کے علاوہ ہمارے خالق نے ہماری فطرت میں اپنی معرفت اور اقرار کا پختہ بیج بھی بوایا ہے۔ قرآنِ پاک میں جس عہدِ الست کا آیت واذاخذ ربک من بنی آدم من ظھورھم و انھم واشھدھم علی انفسھم الست بربکم قالو بلٰی (اعراف - ۱۷۲) میں ذکر ہے اس کی صداقت پر ہر سلیم الفطرت انسان گواہی دے گا۔ لیکن ہماری فطرت میں پیوست یہ بیج چقماق میں آگ کی مانند پوشیدہ ہے اور ضرورت ہے کہ یہ پوشیدہ شرر معرفتِ حق کے نُور سے ایک شعلہ کی مانند بھڑک اٹھے اور یہی اس کتاب کا مقصد ہے۔ اگر مصنّف کی یہ سعی قاری کی معرفت میں کسی اضافہ کا باعث بنے تو وہ اس کے حق میں دُعائے خیر کرے لیکن اگر اسے کہیں کوئی لغزش نظر آئے تو وہ عفو سے کام لے کیونکہ لغزش انسان کا خاصہ ہے اور مصنّف اس سے مبرّا نہیں۔

انتساب

اپنے والد مرحوم کے نام، جن کا
اپنے پیدا کرنے والے سے اُنس و تعلّق نہ
صرف میرے لیے ہی ایک زندہ حقیقت
تھا، بلکہ جس کسی نے بھی اُن کو قریب
سے دیکھا، اُس کو اُن کے اِسی جذبہ
نے متاثر کیا۔

رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا

ہمارا خالق

ہے قیدِ آب و خاک سے باہر مقامِ دِل
مانا خمیرِ مایہ میرا ماء وطین ہے

مغرب کی مادّی تہذیب کے زہریلے اثرات جنہوں نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے، اس قدر وسیع اور ہمہ گیر ہیں کہ مذہب اور مذہب سے تعلّق رکھنے والی ہرشے کو انکار اور اِستہزا کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مذہب کا مرکزی نقطہ خدا تعالیٰ کی ذات ہے، لیکن اس کو

انسانی دماغ کی اختراع قرار دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ انسان نے اپنی جہالت کے زمانہ میں مختلف دیوتاؤں کے تصوّر کی طرح خدا کے تصوّر کو بھی ایجاد کیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہستی باری کے عقیدہ کا خمیر خود انسان کی فطرت میں رکھا گیا ہے اور یہ کوئی ایسا پیچیدہ اور مشکل مسئلہ ہے ہی نہیں کہ جس کے لیے لمبے چوڑے دلائل درکار ہوں، قرآن پاک کی یہ آیت ﴿وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ۙ وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ﴾[1] بہت ہی درست ہے، کیونکہ اگر انسان تنہائی میں خالی الذہن ہو کر یہ سوچے کہ کیا وہ خود بخود پیدا ہو گیا تھا، یعنی وہ خود اپنا خدا ہے، تو اس کا دل گواہی دے گا کہ نہیں ایسا ہرگز نہیں اور اگر وہ خود اپنا پیدا کنندہ نہیں تو ظاہر ہے کہ اس کو پیدا کرنے والی ذات اس کے باہر کوئی اور ہے اور یہ اس کے والدین تو ہرگز ہو نہیں سکتے، کیونکہ جو بات خود اس کی اپنی ذات کے متعلق سچ ہے وہی اُن کے متعلق درست ہے۔ الغرض انسان کا اپنا وجود خود ہی خدا تعالےٰ کی ذات کی سب سے بڑی شہادت ہے اور اکبر الہ آبادی مرحوم نے اس حقیقت کو ایک شعر میں یوں ادا کیا ہے ؎

---

[1] سورۃ الذاریٰت آیت ۲۱، ۲۲ ترجمہ: اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے بہت سے نشان ہیں اور تمہاری اپنی جانوں میں بھی، کیا تم دیکھتے نہیں

مری ہستی ہے خود شاہد وجودِ ذاتِ باری کی
دلیل ایسی ہے یہ جو عمر بھر رَدّ ہو نہیں سکتی

اور مولٰنا رُومؒ نے بھی اسی بات کو مثنوی میں مندرجہ ذیل خوبصورت اشعار میں یوں بیان کیا ہے :-

جنبشِ ما ہر دمے خود اشہدست
کہ گواہِ ذوالجلالِ سرمدست
گردشِ سنگ آسیا در اضطراب
اشہد آمد بر وجودِ جُوئے آب

یعنی ہماری حرکت ہی ہر وقت بڑی گواہ ہے، جو خداوندِ ذوالجلال ہمیشہ رہنے والے کے وجود پر گواہی دیتی ہے اور جس طرح پتھر کی چکّی کی گردش نہر کے وجود پر بڑی گواہ ہے اسی طرح میرا وجود اور میری سب حرکات و سکنات بھی خدا تعالےٰ کی ذات کی گواہ ہیں ، نہ تو پن چکّی بغیر نہر کے پانی کے چل سکتی ہے اور نہ ہی ہیں اور میری حرکات خدا تعالیٰ کی ذات کے بغیر معرضِ وجود میں آسکتی ہیں اور اسی طرح قرآن پاک میں جس عہدِ اَلَسْتُ کا آیت وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْ اٰدَمَ مِنْ ظُھُوْرِھِمْ ذُرِّیَّتَھُمْ وَاَشْھَدَھُمْ عَلٰۤی اَنْفُسِھِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی [1] میں ذکر ہے وہ بھی غور کرنے والے انسان

---

[1] اعراف آیت ۱۷۳ - ترجمہ :- اور جب تیرے رب نے بنی آدمؑ پیٹھوں میں سے ان کی اولادوں کو لیا اور ان کو اپنی

کے لیے ذاتِ باری کی ایک ناقابلِ تردید اندرونی شہادت ہے، کیونکہ انسان کی فطرت کے اندر خالق کی محبّت اور اس کے اقرار کا ایک پختہ بیج بو دیا گیا ہے اور اگر ماحول کے زہریلے اثرات اسے پھلنے اور پھولنے کے لیے جس زندگی بخش غذا کی ضرورت ہے اس سے محروم نہ کر دیں تو ہر وقت اور ہر زماں اُس کی بے اختیار پکار "بلیٰ" ہی ہے۔

دل ازل سے ہے کوئی آج کا شیدائی ہے
تھی جو اک چوٹ پُرانی وہ اُبھر آئی ہے

اور بزبانِ مولٰنا رومؒ

نافِ ما بر مہرِ خود بریدہ اند عشقِ خود در جانِ ما کاریدہ اند

یعنی میری ناف کو عہدِ وفا اور محبّت کی شرط پر کاٹا ہے اور اپنے عشق کو خود ہی میری جان کے اندر پیوست کر دیا ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ مادیت کی خوفناک آندھیاں فطرتِ انسانی میں رکھے ہوئے اس پاکیزہ بیج کو ہزاروں مَن غلاظت کے بوجھ تلے دبا کر تلف کر دیں اور بدقسمتی سے دنیا کا جو نقشہ آج نظر آ رہا ہے، اس پر مندرجۂ ذیل شعر صادق آتا ہے:-

اور تو سب کچھ اُن کی بزم میں ہے اک خدا ہی نظر نہیں آتا

بالوں پر گواہ ٹھہرایا اور پوچھا کیا میں تمہارا رب نہیں۔ انہوں نے کہا ہاں ہم اس بات کی گواہی دیتے ہیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر مادیت کے زہریلے اثرات نے انسان کی پاکیزہ فطرت کو مسخ نہ کر دیا ہو تو خدا تعالیٰ کی ذات ہی انسان کے نزدیک سب سے بڑی صداقت ہے اور اس کے سوا باقی سب کچھ ہیچ ہے کہ یہ محض اس کی ذات کا ظہور ہے۔ کیا درخت کے بغیر سایہ کی یا سورج کے بغیر دھوپ کی کچھ حقیقت ہے؟

سُنو! آتی ہے ہر طرف سے صدا
کہ باطل ہے ہر چیز حق کے سوا

ہماری فطرت کی اس آواز اور پکار کے علاوہ ہستیٔ باریؒ کے ثبوت میں اتنے محکم عقلی اور نقلی دلائل ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ انہیں ردّ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ آئیے ذرا سائنس کی روشنی میں اس وسیع مادی عالم پر غور کریں اور دیکھیں کہ کس طرح اس کا ایک ایک ذرہ پکار پکار کر اپنے خالق کی شہادت دے رہا ہے:۔

ہر دم از کاخِ عالم آواز لیست کہ یکش بانی و بنا سازلیست
ایں جہاں را عمارت انداز لیست واز جہاں برتر است و ممتاز لیست

یعنی یہ نظامِ عالم اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ اس جہان کا کوئی بانی اور صانع ضرور ہے وہ اس جہان کو بنانے والا ہے مگر خود جہان سے بالاتر اور ممتاز ہے۔

سب سے پہلے انسان کو لیجئے، انسان کی پیدائش اور اس کا جسم ایک حیرت انگیز معجزہ ہے۔ اگرچہ علم الابدان اور انسان سے متعلقہ دوسرے سب علوم کے دفتر اس معجزہ کی تفصیلات سے بھرے پڑے ہیں، لیکن چند مختصر اشارات یہاں بے موقع نہ ہوں گے۔ ایک واحد خورد بینی ذرہ ایک دوسرے خورد بینی ذرّہ سے اتصال پر اپنی پیدائش اور ترقی کی کہانی رحمِ مادر کے اندھیروں میں جس طرح شروع کرتا ہے اور پھر رحمِ مادر کی تنگ اور تاریک دنیا سے باہر اسے جس طرح جاری رکھتا ہے وہ تمام الف لیلوی قصّوں کو بے حقیقت بناتا ہے۔ پہلے سوچئے کہ کس طرح یہ ذرّہ جسے اپنا کچھ بھی علم نہیں ایک مقررہ میعاد کے اندر پورا پورا انسان بن جاتا ہے اگرچہ ہر طرح سے مکمّل لیکن بغیر جان اسی طرح پڑا رہتا ہے حتیٰ کہ جب نفخِ روح کا وقت آتا ہے تو یہ جسدِ بے جان رحمِ مادر کے اندر زندہ ہو جاتا ہے۔ کُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاکُمْ[1] اس کی اسی حالت کا نقشہ ہے۔ موت کے بعد زندگی کا انکار اور شک کرنے والوں کو غور کرنا چاہیئے کہ کیا وہ پہلے مُردہ سے زندہ نہیں ہو چکے اور اگر یہ ماجرا ایک دفعہ ان سے ہو گزرا ہے تو دوبارہ اس کے ہونے پر متعجب کیوں ہیں۔

پھر کس قدر حیرت کی بات ہے کہ رحمِ مادر کی چند انچ جگہ میں پڑا

---

[1] سورۃ بقرہ: آیت ۲۹۔ ترجمہ۔ تم بے جان تھے، لیکن اس نے تمہارے اندر جان ڈال دی۔

ہُوا ایک جسدِ بے جان اس وسیع و عریض دنیا کے لیے جو باہر اس کی منتظر ہے ہر قسم کی استعدادیں حاصل کر رہا ہے تا اپنی پیدائش کے بعد جو سفر اسے درپیش ہے اس کے لیے پوری طرح آراستہ ہو۔ خود اس قدر چھوٹا ہے کہ خورد بین کے بغیر نظر نہیں آسکتا، لیکن تمام انسانی اعضا کو اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے۔ ویسے تو سب انسانی اعضا حد درجہ پیچیدہ ہیں اور دنیا کی پیچیدہ سے پیچیدہ مشینوں کو شرماتے ہیں، لیکن انسانی دماغ کے مقابلہ میں تو نہ کوئی مشین آج تک بن سکی ہے اور نہ بن سکے گی کیونکہ یہ غور و فکر کرنے کی غیر مادی قوت سے آراستہ ہے جس کے سبب ترقی کی لامتناہی منازل طے کرتا ہوا انسان آج اپنے مسکنِ خاکی سے نکل کر چاند تک جا پہنچا ہے، غور کریں کہ پہلا انسان غاروں کا مکین اور آج کا انسان زمین سے باہر خلا اور چاند میں اپنی رہائش گاہیں تعمیر کرنے کے منصوبوں میں مصروف! پہلے انسان کی ساری دوڑ پتھروں کے استعمال تک محدود اور آج کا انسان ایٹم کو پھاڑ کر اس کی بے پناہ قوت کا مالک! الغرض انسانی دماغ کی یہ غور و فکر کی قابلیت (جو دوسرے الفاظ میں مادی اشیاء کو غیر مادی میں منتقل کرنے کے عمل کا نام ہے) اس کا سب سے بڑا شرف ہے۔ کیا گندم کی روٹی جو لقمان کی غذا بنی حکمتِ لقمان کے رنگ میں ظاہر نہ ہوئی؟ اگر لقمان کو گندم کی روٹی نصیب نہ ہوتی، تو

حکمتِ لقمان کا کہاں نشان ہوتا؟

عقل کے پجاری اور روح کے منکروں نے کیا کبھی یہ غور نہیں کیا کہ عقل جو ایک خالص غیر مادی جوہر ہے اس کا روٹی اور انسان کے دماغ سے بھلا کیا تعلق ہو سکتا ہے، کیونکہ یہ تو مادی کا غیر مادی سے تعلّق ہو گا اور اس کے وہ قائل نہیں اور بدیں وجہ روح کو تسلیم نہیں کرتے۔ الغرض انسان کی پیدائش، اس کا جسم اور اس کے کارنامے عجیب وغریب کمالات کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ کیا یہ سب کچھ از خود ہی ہو گیا ہے؟

چل رہی ہے جس سے جسمانی مشین
کوئی پوشیدہ کمانی اور ہے

اب ذرا انسان سے باہر دیکھئے، ساری کائنات ایک حد درجہ نظام اور ترتیب سے آراستہ نظر آتی ہے۔ ہماری دنیا اپنے محور کے گرد ۲۴ گھنٹوں میں گھومتی ہے اور ہمارے لیے دن اور رات کا سلسلہ پیدا کرتی ہے تاہم دن کو کام اور رات کو آرام کر سکیں۔ پھر یہ سورج کے گرد سال میں ایک دفعہ اپنی گردش پوری کرتی ہے اور ہم کو ہمارے چار موسم یعنی گرمی، سردی، خزاں اور بہار مہیّا کرتی ہے۔ دیگر بے شمار فوائد کے علاوہ موسموں کا یہ چکّر ہمارے لیے مختلف اقسام کے پھل اور فصلوں کا باعث بنتا ہے۔ خود ہماری زمین اپنی

گنجان آبادیوں ، سربفلک عمارتوں ، اُونچے پہاڑوں ، وسیع میدانوں، دھاتوں سے بھرپور، کانوں ،گہرے سمندروں اور جو کچھ اس کے اندر ہے ان سب کے سمیت خلا میں ۶۸۴۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے حرکت کر رہی ہے ، لیکن اس کی یہ حرکت اس قدر بے معلوم ہے کہ اگر سائنس نے اس کا کھوج نہ پایا ہوتا تو انسان زمین کو آج تک جامد اور ساکن ہی سمجھتا۔ خیال کریں کہ ایک ہلکے سے بوجھ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لیے یا ایک ساکن شے کو حرکت میں لا کر اس کی حرکت کو مستقل طور سے جاری رکھنے کے لیے کس قدر طاقت کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر سوچیں کہ ہماری زمین اور دوسرے بے شمار اجرامِ سماویہ جو خلا میں گردش کرتے چلے آ رہے ان کی حرکت کے لیے کتنی بے پناہ قوت درکار ہوگی اور ان کو حرکت میں رکھنے والا ہاتھ کس قوت کا مالک ہوگا۔

مختلف اجرامِ فلکی خلا میں اپنے مقرر کردہ راستوں پر اس التزام اور باقاعدگی سے گردش جاری رکھے ہوئے ہیں کہ اُن کے سامنے دنیا کی بہترین گھڑیاں ہیچ ہیں۔ عمدہ سے عمدہ گھڑی جو انسانی ہاتھوں سے بن سکی ہے۔ ہر ہفتہ میں چند سیکنڈ کی غلطی ضرور کرتی ہے اور اس کی اصلاح صرف ستاروں کی گردش کا حساب رکھنے والے سائنسی آلات کی مدد سے (جو تجربہ گاہوں میں نصب ہیں) ہی ممکن ہے۔ کیا یہ سب

قوانین جو ساری کائنات پر محیط ہیں اور جن سے کچھ بھی باہر نہیں از خود جاری ہو گئے ہیں ؟ کیا عقل ایسی احمقانہ بات کو باور کر سکتی ہے ؟

اس سلسلہ میں ایک منکرِ ہستیٔ باری کا قصہ جس کو اس کے خدا پرست دوست نے شرمندہ کیا شاید بے محل نہ ہو گا۔ ہر قسم کے عقلی دلائل دے چکنے کے بعد کہ دنیا ہر گز خالق کے بغیر معرضِ وجود میں نہیں آ سکتی اُس خدا پرست انسان نے ایک دن اپنے مطالعہ کے کمرہ میں دنیا کا ایک گلوب تیار کروا کر رکھ دیا۔ جونہی اس کا دہریہ دوست اس کو ملنے کے لیے اس کے کمرہ میں داخل ہُوا تو فوراً اس گلوب کو ایک نئی شے جو پہلے وہاں موجود نہ تھی پا کر دریافت کیا کہ یہ کس نے بنا کر وہاں رکھ دیا ہے اور جواب میں یہ سُن کر کہ یہ از خود پیدا ہو کر نمودار ہو گیا ہے اور کسی نے بھی اسے وہاں نہیں رکھا اسے اپنے ساتھ حد درجہ کا تمسخر اور مذاق تصوّر کیا اور کھِل کھِلا کر ہنس پڑا اور کہنے لگا کہ کیا وہ اس درجہ احمق تصوّر کیا جاتا ہے کہ یہ جواب قبول کر سکے۔

اس پر اُس کے خدا پرست دوست نے کہا کہ اگر یہ چھوٹا سا گلوب از خود پیدا نہیں ہو سکتا تو پھر اسے یہ سیدھی سی بات کیوں سمجھ نہیں آتی کہ اتنا بڑا گلوب یعنی ہماری دنیا اور دوسرے اَن گنت گلوب جن کے مقابلہ میں ہماری دنیا ایک ذرّۂ خاکی سے بھی کم ہے

خود بخود کس طرح پیدا ہو سکتے ہیں اور پھر سب کے سب عجیب و غریب قوانین کے ماتحت آپس میں منسلک اور مربوط بھی۔

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کی عظیم صنعت گری اور حکیمانہ کار کردگی کا جو نقشہ سائنس پیش کرتی ہے اس پر غور کر کے انسانی دماغ بالکل شل ہو جاتا ہے۔ ہماری دنیا تو ایک حقیر ذرہ ہے اور اس کے باہر خلا میں جو کچھ موجود ہے وہ اس قدر عظیم اور پُر ہیبت ہے کہ دل یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے:-

اے خداوندِ خلق و عالمیاں　　خلق و عالم ز قدرتت حیراں
چہ مہیب است شان و شوکتِ تو　　چہ عجیب است کارِ صنعتِ تو

یعنی اے جہانوں اور مخلوقات کے آقا! دنیا اور مخلوق تیری قدرت سے حیران ہے۔ تیری شان و شوکت کس قدر باعظمت ہے تیری صنعت اور تیرا کام کتنا عجیب ہے۔

رات کے اندھیرے میں روشنی حاصل کرنے کی خاطر یا سردی جس سے ہم تھرتھرا رہے ہوں اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے ایندھن حاصل کر کے جب ہم آگ جلاتے ہیں تو اس سے محض چند گز تک کا اندھیرا ہی زائل ہوتا ہے اور تھوڑی سی ہی حرارت پیدا ہوتی ہے لیکن اس کے مقابلہ میں سورج کو دیکھ کر انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ کس طرح روشنی اور حرارت پیدا کرنے کے دونوں عمل اس کے ذریعہ کسی

محدود جگہ کے لیے نہیں بلکہ جہانوں کے لیے کس درجہ کمال سے سرانجام پا رہے ہیں اور پھر کروڑہا سال سے نہ اس کی روشنی میں کمی آتی ہے اور نہ گرمی میں اور اس کا کام مستقل طور سے جاری رکھنے کے لیے اسے ایک ایٹمی بھٹی بنا دیا گیا ہے تا یہ خود بخود (بغیر کسی ایندھن کے جس کی اسے باہر سے ضرورت ہو) اپنا فرضِ منصبی ادا کرتا رہے۔

خلا کی وسعتیں جن میں اجرام سماویہ اپنا اپنا کام کر رہے ہیں اور ان کی تعداد اور ان کا حجم اور آپس میں ان کے فاصلے غور کرنے پر انسان کو انگشت بدنداں کرتے ہیں۔ ان کی تعداد کا تو یہ عالم ہے کہ دنیا کے سب سمندروں کے ساحلوں پر جس قدر ریت کے ذرّے ہیں، اُن کی تعداد ان سے زیادہ ہے۔ اگر خیال ہو کہ پھر فضا تو اُن کی اس کثرت کی وجہ سے کھچا کھچ بھری ہوئی ہوگی، تو اس کا جواب یہ ہے کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ خلا کی وسعت کی کیفیت یہ ہے کہ اجرامِ فلکی کے اس کثرت کے باوجود یہ تقریباً خالی پڑی ہے، مثال کے طور پر اگر تین بھڑیں لے کر اُنہیں یورپ کے برّاعظم کی فضا میں اُڑا دیا جائے تو جس قدر جگہ یہ تین بھڑیں یورپ کی فضا میں گھیریں گی اس سے کم جگہ فضا میں سب اجرام نے گھیری ہوئی ہے۔ اُن کی دُوری کا یہ حال ہے کہ ستاروں کے بعض سلسلے دوسرے سلسلوں سے اس قدر دُور ہیں کہ انسانی ذہن ان کا تصوّر

ہی نہیں کر سکتا اور یہ میلوں میں ناپے ہی نہیں جا سکتے۔ اس لیے ان کو قابلِ فہم بنانے کے لیے سائنس دانوں نے نوری سالوں کا پیمانہ وضع کیا ہے۔ روشنی ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کی رفتار سے سفر طے کرتی ہے یعنی ایک سیکنڈ میں ہماری دنیا کے گرد سات مرتبہ چکّر لگا لیتی ہے اور سال بھر کی مدّت میں یہ ساٹھ کھرب میل کی مسافت طے کر لیتی ہے۔ اس طرح ایک نوری سال ساٹھ کھرب میل کے فاصلہ کے برابر ہے۔ اور سائنس دانوں سے یہ سُن کر کہ بعض اجرام سماویہ ہماری دنیا سے چالیس لاکھ نوری سالوں کی دُوری پر واقع ہیں انسانی عقل ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتی ہے۔

سورج کی روشنی ہم تک 8 منٹ میں پہنچتی ہے لیکن ستارے ابط الجوزا سے یہ سو سال کے عرصہ میں پہنچتی ہے اور اس کا قطر (یعنی ایک طرف سے دوسری طرف کا فاصلہ) 27 کروڑ تیس لاکھ میل ہے، یا یوں سمجھیئے کہ زمین سے سورج کا جو فاصلہ ہے اس سے بھی تین گُنا بڑا اور یہ بعض دوسرے انتہائی بڑے ستاروں کے مقابلہ میں بہت چھوٹا ہے، کیونکہ اُن میں سے بعض عظیم ستاروں کا قطر ایک ارب میل سے بھی زیادہ ہے اور بعض ستارے مثلاً CEPHEDS اس قدر روشن ہیں کہ ہمارے سورج سے

ان کی روشنی ۶۰ ہزار گنا زیادہ ہے۔ پھر ہمارے نظامِ شمسی کی طرح دوسرے بیشمار نظامہائے شمسی اور ستارے خلا میں تیر رہے ہیں اور پھر کہکشاں سے باہر تو ستاروں کے ایسے نہ ختم ہونے والے جزائر اور سلاسل ہیں کہ ان کے مقابلہ میں کہکشاں میں موجود سب کچھ ہیچ ہے۔ ہر پہلے سے طاقتور دُوربین جب انسان بنا لیتا ہے تو اس کی مدد سے اُسے خلا میں مزید ستاروں کی دنیاؤں کا سراغ مل جاتا ہے اور یہ سلسلہ دن بدن آگے ہی دوڑتا جاتا ہے اور بظاہر یوں معلوم دیتا ہے کہ سائنس اور علمِ ہئیت کے ماہروں نے اجرامِ سماویہ اور کائنات کی وسعتوں کے متعلق تاحال جو کچھ دریافت کیا ہے وہ اصل حقیقت کا ابتدائی اور دھندلا سا نقشہ ہے۔ صانعِ عالم کے ان کمالات کا تصوّر کر کے انسان کا قدرتی اور طبعی ردِّ عمل دل کی گہرائیوں سے اُٹھتی ہوئی صدائے اللہ اکبر کے ساتھ آستانہ اُلوہیت پر جبینِ نیاز کو خاک آلود کرنے کے سوا بھلا اور کیا ہو سکتا ہے اور قرآن کریم کی آیت اِنَّمَا یُؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِھَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّھِمْ وَھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ[1] میں اسی حالت کا ذکر ہے، لیکن اس اندھی عقل کی گمراہی

---

[1] سورۃ سجدہ آیت ۱۶۔ ترجمہ:۔ ہماری آیتوں پر تو وہی لوگ ایمان لاتے ہیں کہ جب ان کو ان کے متعلق یاد دلایا جاتا ہے تو وہ سجدہ کرتے ہوئے زمین پر گر جاتے ہیں اور اپنے رب کی تعریف اور تسبیح کرتے ہیں اور تکبّر نہیں کرتے۔

کا ماتم کن الفاظ میں کیا جائے، جو اس سب کے باوجود اس ذاتِ عظیم کے متعلق بحث اور تکرار کرتی ہے اور قرآن کریم کی آیت قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ[1] کس خوبصورتی سے اس روحانی نابینائی کا نقشہ کھینچتی ہے ؎

ہر چیز میں خدا کی ضیا کا ظہور ہے
پر پھر بھی غافلوں سے وہ دلدار دُور ہے

نیوٹن (NEWTON) نے سب سے پہلے اجرامِ سماویہ کی حرکت کے قوانین دریافت کیے، جب وہ ان کو دریافت کر چکا تو بے اختیار ہو کر پکار اُٹھا کہ یہ مادی عالم ایک عظیم الشان اور بہت بڑی قدرتوں والی ذات (جس نے اُسے پیدا کیا ہے) کی واضح نشاندہی کرتا ہے اور یہ ذات ہمیشہ سے ہے اور ہر جگہ ہے اور اس عالم کو پیدا کرنے کے بعد اس پر اس کی ایسی کامل حکومت ہے کہ اس کے مقابلہ میں ہمارے جسموں اور ہمارے اعضا پر ہماری حکومت بالکل ہیچ ہے۔

کائنات کے عظیم و مہیب اور نظر آ سکنے والے مظاہر سے ہٹ کر اب ذرا آنکھ سے نظر نہ آ سکنے والے حقیر ذرّوں کی دنیا کے متعلق بھی کچھ سُنیئے اور دیکھیئے کہ ان کی پیدایش اور وجود میں کن کمالات کا مظاہرہ ہُوا ہے۔ انسان کا خود اپنا مقام ان دونوں حدود یعنی

---

[1] سورۃ ابراہیم آیت ۱۱۔ ترجمہ۔ ان کے پیغمبروں نے انہیں کہا کہ تمہیں اللہ کے متعلق کوئی شک ہے جو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے؟

ایک طرف بڑے بڑے اجرامِ سماوی اور دوسری طرف آنکھ سے
نظر نہ آسکنے والے حد سے زیادہ چھوٹے چھوٹے ذرّوں کے درمیان
ہے۔ان میں سے پہلے جراثیم کو دیکھئے یہ اس قدر چھوٹے ہیں کہ صرف
خورد بین سے ہی اُن کا پتہ لگ سکتا ہے لیکن اپنی زندگی اور اپنی
افزائش، اپنی موت اور اپنی پیدائش کا عجیب سلسلہ اپنے اندر لیے
ہوئے ہیں اور علمِ طب کے ماہروں کو یقین ہے کہ انسانی زندگی کی
صحت و بیماری، بقا اور قیام کے کئی لاینحل عقدوں کی گرہ کشائی
اسی دنیا کے علم سے وابستہ ہے اور جوں جوں انسان اس میں
غوطہ زن ہوتا جائے گا توں توں انسانی زندگی سے متعلق بہت
سے سربستہ راز وا ہوتے جائیں گے۔

مادے کی دنیا میں ایٹم کی تحقیق اور تجزیے کے سلسلے میں جو جدید
انکشافات ہوئے ہیں وہ حیرت انگیز ہیں۔ اشیاء جو ٹھوس نظر آتی
ہیں اصل میں ان کی ماہیّت وہ نہیں جو آنکھ دیکھتی ہے بلکہ اُن
کے اندر ایک عجیب و غریب دنیا کام کر رہی ہے مثلاً آگ پر
رکھے ہوئے ایک برتن کے متعلق جس سے بھاپ نکل رہی ہو
اگر یہ سوال ہو کہ کیا اس دھات کے اجزا جس کا یہ برتن بنا ہُوا ہے،
ساکن ہیں یا متحرک ہیں تو ہمارا فوری جواب ہوگا کہ یقیناً ساکن ہیں۔
کیونکہ دھات ٹھوس ہے البتہ بھاپ جو اس سے نکل رہی ہے وہ

متحرک ہے۔ لیکن سائنس کہتی ہے کہ یہ جواب درست نہیں، کیونکہ
اس برتن کی دھات کے اجزا سوائے الیکٹرانز اور پروٹانز کے مجموعہ
کے اور کچھ نہیں اور یہ الیکٹرانز ہر لمحہ اور ہر وقت اس دھات
کے ایٹم کے نقطۂ مرکزی یعنی پروٹانز کے گرد بلا کی رفتار سے
گردش کر رہے ہیں اور ایک سیکنڈ میں ۱۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰ سے
بھی زیادہ دفعہ اپنے مرکزی نقطہ کے گرد چکر لگا لیتے ہیں اور جب سے سائنس نے
ایٹم کا تجزیہ کر کے اس میں محصور الیکٹرانز اور پروٹانز کو دریافت
کر لیا ہے، مادّہ کے متعلق پہلا نظریہ کہ یہ محض ذروں کا جامد
مجموعہ ہے غلط ثابت ہو چکا ہے اور اب یہ بات سائنس کی
ایک پختہ اور تسلیم شدہ صداقت ہے کہ مادہ اصل میں الیکٹرانز
اور پروٹانز کا مجموعہ ہے جو اس کے اندر ہر وقت حرکت کی حالت
میں ہیں اور پھر ایٹم کا حال بالکل خلا کے نظامِ شمسی کے مشابہ
ہے یعنی جیسے نظامِ شمسی میں ستارے اس کے نقطۂ مرکزی کے
گرد گردش کرتے ہیں اسی طرح ایٹم کے اندر بھی اس کے الیکٹرانز
ستاروں کی رفتار کے ساتھ پروٹانز کے گرد گردش کرتے ہیں۔
اگرچہ ایٹم ہم کو نظر نہیں آ سکتا، لیکن سائنس نے اس کے
اندر الیکٹرانز کی رفتار اور حرکت تک کو بھی ناپ لیا ہے اور یہ
ایک حقیقت ہے کہ ایٹم میں پروٹانز کے گرد اس کے الیکٹرانز ایک

انچ کے دس لاکھویں حصّہ سے کم دائرے میں پستول کی گولی کی رفتار سے ہر وقت گردش کر رہے ہیں اور غضب یہ ہے کہ ان کی یہ گردش جو ہمارے ستاروں کی گردش سے تیز تر ہے اس درجہ انتہائی چھوٹی جگہ یعنی ایک انچ کے دس لاکھویں حصّہ میں (جہاں یہ محصور ہیں) ہو رہی ہے۔ غور کریں کہ ایک طرف تو خلا کی حیرتناک وسعتوں کے اندر نظامِ شمسی میں ستاروں کی گردش اور دوسری طرف بالکل ویسے ہی ایک حد سے زیادہ تنگ اور محدود دائرہ یعنی ایٹم کے اندر وہی سب کچھ۔ اس طرح ایٹم کا نظام اور نظامِ شمسی مادّی عالم میں دو متوازی نظام ہیں جس کا سائنس پتہ دیتی ہے، ایک حد درجہ چھوٹے دائرہ میں اور دوسرا حد درجہ وسیع وعریض خلا میں، لیکن دونوں باہم مماثل اور صرف یہی نہیں بلکہ جس طرح نظامِ شمسی میں سورج اور اس کے گرد گردش کرنے والے ستاروں کے درمیان فاصلے ہیں اسی طرح ایٹم میں بھی اس کے نقطہ مرکزی اور اس کے گرد حرکت کرنے والے الیکٹرانز میں فاصلے ہیں۔ اگر ایک قوی ہیکل انسان کو جو چھ فٹ لمبا اور تین من بھاری ہو ایک شکنجہ میں دبا کر اس طرح سُکیڑا جائے کہ اس کے جسم کے الیکٹرانز اور پروٹانز کے درمیان جو فاصلے اور خالی جگہیں ہیں وہ سب یکسر اس دباؤ کے عمل کے نتیجہ میں خارج اور معدوم ہو جائیں اور تمام

کے تمام الیکٹرانز اور پروٹانز یک جان اور اکٹھے ہو جائیں تو یہ قوی الجثہ انسان گھٹ کر ایسے ذرّہ کے برابر رہ جائے گا کہ جسے صرف آتشین شیشہ کی مدد سے ہی دیکھا جا سکے گا۔ ایٹمی سائنس نے ان انتہا سے زیادہ چھوٹے ذرّوں کے متعلق اب تک جو راز دریافت کیے ہیں، ان کے مدِ نظر یوں لگتا ہے کہ مادّہ کے حقیر ذرّوں کے اندر بے پناہ قوت اور طاقت کے خزانے پنہاں ہیں اور دنیا اس بات کی منتظر ہے کہ کب ذہین وفطین انسان کا ہاتھ اس کی اسیر قوتوں کی رہائی کے رازوں کا بھید پا کر دنیا کا نقشہ بدل دے۔

مثال کے طور پر کوئلہ کے ایک مٹر برابر ریزہ میں اس قدر ایٹمی قوت موجود ہے کہ ایک عظیم الشان سمندری جہاز کو جس میں ہزاروں مسافر سوار ہوں اور جس میں ایک بڑے عالیشان ہوٹل کی سب آسائشیں موجود ہوں، یہ انگلستان سے امریکہ اور وہاں سے واپس انگلستان لا سکتا ہے اور اسی طرح کوئلہ کے ایک پاؤنڈ کے اندر جو ایٹمی توانائی موجود ہے وہ اگر کسی صورت میں اس سے حاصل کی جا سکے تو انگلستان جیسے ترقی یافتہ اور صنعتی ملک کی پندرہ دن کی جملہ ایندھن کی ضروریات اس سے بخوبی پوری ہو سکتی ہیں۔

کیا عجب تُو نے ہر ایک ذرّہ میں رکھے ہیں خواص
کون پڑھ سکتا ہے سارا دفتر اِن اسرار کا

خلاصہ کلام یہ کہ خواہ ایک خاک کے ذرّے کو دیکھیں یا خلا میں بڑے سے بڑے ستارے کو، ان دونوں کی حقیقت جب انسان پر کُھلتی ہے تو اُسے سکتہ کے عالم میں ڈال دیتی ہے اور دونوں پر ایک جیسی ثبت مُہر ایک ہی بنانے والے کی نشان دہی کرتی ہے ؎

ہے عجب جلوہ تری قدرت کا پیارے ہر طرف
جس طرف دیکھیں وہی راہ ہے ترے دیدار کا

لیکن جس کی فطرت ہی مسخ ہو گئی ہو اور روحانی نابینائی کا شکار ہو اس کا کیا علاج۔ اسے تو اپنے اندھے پن کی وجہ سے یہ موٹی بات جو اکبرؔ مرحوم نے یوں بیان کی :

ذہن میں جو گھِر گیا لا انتہا کیوں کر ہُوا
جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیوں کر ہُوا

نظر نہیں آرہی اور خود حد درجہ محدود ہونے کے باوجود یہ مطالبہ کر رہا ہے کہ کیوں وہ ذات جو بے حدّ و عدّ ہے اپنی خدائی کو چھوڑ کر اپنے عرشِ عظیم سے الگ نہیں ہو جاتی تا ایک احمق اور نادان کا یہ مطالبہ کہ غیر محدود محدود کے اندر سما جائے پورا ہو سکے۔ ع

بریں عقل و دانش بباید گریست

الغرض یہ ہے ہمارا خالق اور یہ ہے ہمارا ربّ ! فَذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمُ الْحَقُّ (یونس آیت ۳۲) اور دنیا میں جس قدر بھی مذاہب آئے ہیں ان کے لانے والوں نے اسی کو پیش کر کے اس کا قرب حاصل کرنے کی تلقین کو ہی اپنی تعلیم کا مرکزی نقطہ قرار دیا ہے اور حقوق اللّٰہ اور حقوق العباد کا تعیّن کر کے اسی مقصد کو حاصل کرنے کی عملی راہیں بتائی ہیں۔

حقوق اللّٰہ کی غرض حق تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا ہے اور اسی طرح حقوق العباد کی بھی یہی غرض ہے کیوں کہ جب انسان مخلوقِ خدا کی خدمت کرے گا تو اُسے اللّٰہ کا قرب حاصل ہوگا وجہ یہ کہ تمام مخلوق ایک طرح سے حق تعالیٰ کی عیال ہے ۔ اگر آپ کسی کے بچّے کو اپنی گود میں اُٹھا کر اس سے پیار کریں گے یا اس کے ہاتھ میں مٹھائی کی ایک ڈلی رکھ دیں گے تو کیا اُس کے ماں باپ کے دل میں آپ کے لیے قدر و محبّت نہ پیدا ہو گی؟ حقوق العباد کا چونکہ ہمارے اس مضمون سے تعلّق نہیں ، اس لیے ہم صرف حقوق اللّٰہ تک ہی اپنی بحث کو محدود رکھتے ہیں۔حقوق اللّٰہ کے متعلق تمام مذاہب نے بشمولِ اسلام دو باتوں پر سب سے زیادہ زور دیا ہے :۔

اوّل ۔ یہ کہ حق تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنایا جائے۔

دوم۔ یہ کہ سب سے بڑھ کر محبت حق تعالیٰ کی ذات سے کی
جائے۔ لیکن افسوس کہ مُرورِ زمانہ کے ساتھ اسلام کے متبعین
نے بھی دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کی طرح سچ کے
ساتھ کھوٹ ملا لیا، چنانچہ اس وقت مسلمانوں میں ایک طرف
تو بعض لوگ قبر پرستی اور پیر پرستی میں گرفتار ہیں تو دوسری
طرف بعض لوگ حق تعالےٰ سے محبت کے ہی منکر ہیں۔ شرک سے
اس لیے روکا گیا ہے کہ مشرک سے زیادہ گم گشتہ منزل اور
کوئی ہے ہی نہیں۔ ظاہر ہے کہ جسے سچے اور حقیقی خدا کا علم ہی
نہیں وہ اس کا قُرب کیوں کر حاصل کرے گا، پھر مشرک سے
زیادہ خود اپنی توہین کرنے والا کوئی نہیں کیونکہ جن اشیاء پر
اسے حکمرانی کے لیے پیدا کیا گیا ہے وہ اُن کے آگے ہی
عجز و نیاز سے اپنا سر خم کرتا ہے۔ اور جو حق تعالےٰ سے
سب سے بڑھ کر محبت کرنے کا حکم ہے وہ اس لیے ہے کہ
اس سے بڑھ کر حقیقت میں انسان کی محبت کا دوسرا کوئی حقدار ہی
نہیں، لیکن بد قسمتی سے مسلمانوں میں کچھ لوگ اس کا اس وجہ
سے انکار کرتے ہیں کہ یہ ایک جنس کی دوسری جنس سے محبت
ہے اس لیے محال ہے اور کچھ لوگ اس وجہ سے اس کے
قائل نہیں کہ ان کے خیال میں اس میں انہماک انسان کی کام کرنے

والی قوتوں کو بیکار کرتا ہے اور جہاں جہاں اسلام کی تعلیم میں اس کی تلقین ہے اس سے مراد صرف اطاعتِ الٰہی ہے وبس۔ ان دو گروہوں کے علاوہ باقی لوگ دنیا طلبی اور فکرِ معاش میں اس قدر منہمک ہیں کہ ان کے پاس فرصت ہی نہیں کہ وہ اپنی خواہشاتِ نفس کے علاوہ کسی اور بات کا خیال بھی کرسکیں اور بقول مولانا رومؒ ؎

عامہ را از عشق ہم خوابہ طبق
کے بود پروائے عشقِ صنعِ حق

یعنی عوام النّاس کو جو کھانے پینے کی لذّات اور اپنے بیوی بچوں کی رونق میں مست ہیں بھلا حق تعالٰے کی صنعت گری سے کب عشق و محبّت کی فرصت ہے۔

آئیے ہم محبّت کی ماہیت پر غور کریں اور اصل حقیقت کا پتہ لگائیں اور دیکھیں کہ کیوں حق تعالٰے کے سوا کوئی دوسرا وجود نہ تو اس جیسا ہماری محبت کا حقدار ہے اور نہ ہی کسی دوسرے وجود سے ہماری محبت حقیقی اور دائمی راحت کا باعث بن سکتی ہے۔

سب سے پہلے تو ہم منکرینِ محبتِ حق سے پوچھتے ہیں کہ کیا وہ خود محبّت سے واقف نہیں اور کیا ان کا اپنا دل اس

لطیف جذبہ سے خالی یا نا آشنا ہے ؟ کیا ان کے نزدیک یہ ایک حقیقت نہیں کہ انسان کا دل ہر قسم کی محبتوں کی ایک جولانگاہ ہے - ماں باپ کی محبّت ، اولاد کی محبّت ، عزیز واقارب کی محبّت ، دولت کی محبّت ، جاہ وحشم کی محبت ، اقتدار اور حکومت کی محبّت ، وطن کی محبّت ، علم کی محبّت اور اسی طرح کی انسانی قلب میں پیدا ہونے والی دیگر محبتوں سے کیا وہ واقف نہیں؟ اور کیا تاریخِ عالم کا ایک بہت بڑا حصّہ صرف اسی ایک جذبہ کی داستان نہیں ؟ اور اگر یہ درست ہے تو پھر یہ کس قدر حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ وہ ذات جس نے انہیں پیدا کیا اور پھر پالا پوسا ہے اور جس سے محبّت فلاحِ دارین کا باعث ہے اس سے وہ محبت کے قائل ہی نہیں۔

یک چشمِ دیدنت تو بازنیست
زیں دلِ تو محرمِ ایں رازنیست

یعنی چونکہ تیری روحانی آنکھ کھلی ہوئی نہیں اس لیے تیرا دل اس راز سے واقف نہیں۔

غور کرنے پر پہلی بات جو ہم کو نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ خالق کی محبّت کا بیج انسان کی فطرت میں رکھا گیا ہے۔

دل نمی گیرد تسلّی جز خدا   ایں چنیں افتاد فطرت زِ ابتدا

یعنی خدا کے بغیر انسان کا دل تسلی نہیں پاتا اور ابتدا سے آدمی کی یہی فطرت ہے۔ اگرچہ یہ الگ بات ہے کہ اِنسان خواہشاتِ نفس میں گرفتار ہو کر فطرت میں رکھے ہُوئے اس پاک بیج کی پرورش کی بجائے اسے کچل دے۔ کیونکہ ایک نازک بیج اسی صورت میں ایک تن آور درخت بن سکتا ہے، جب کہ اس کی پوری طرح سے آبیاری اور دیکھ بھال کی جائے۔ لیکن اگر اسے پاؤں تلے مسل دیا جائے تو وہ کب بڑا ہو کر اپنے سایہ اور پھل سے مخلوقِ خدا کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان اپنے پیدا کرنے والے سے محبت کا جذبہ لے کر پیدا ہُوا ہے اگرچہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ از راہِ گمراہی وہ اس کی جگہ کسی جھوٹے خدا یا خداؤں سے اپنا پیمانِ عشق و محبّت باندھ لیتا ہے اور اس طرح اپنی فطری تسکین کا غلط سامان ڈھونڈتا ہے جیسے کہ قرآن پاک میں اس آیت میں ذکر ہے: مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ۭ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ (عنکبوت: ۴۱)

یعنی ان لوگوں کی مثال جنہوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسروں سے محبت

اور دوستی کے تعلقات قائم کیے ہیں اس مکڑی کی طرح ہے جس نے اپنا گھر تو بنایا لیکن گھروں میں سے کمزور ترین گھر مکڑی کا ہوتا ہے، کاش وہ جانیں۔ اور پھر قرآن پاک میں حق تعالےٰ نے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ ۝ (ذاریات: ۵۶) فرما کر ہماری زندگی کے اصل مدعا کو واضح کر دیا ہے اور یہ اس کی شان کے خلاف ہے کہ وہ ایک شے کو خاص مقصد کے لیے پیدا تو کرے۔ لیکن اس کے حصول کے لیے جو ضروری ہو وہ اُسے نہ دے اور جب ہماری زندگی کا مقصد خالق کی عبادت یعنی اس کی صفات کو جذب کر کے اس کا قرب حاصل کرنا ہی ٹھہرا تو پھر یہ ناممکن ہے کہ اس مقصد کو پانے کے لیے سب ضروری طاقتیں ہماری فطرت میں نہ رکھی گئی ہوں اور یہ صاف ہے کہ کسی شے کو حاصل کرنے کی پہلی شرط اس کی تڑپ اور پیاس ہی ہو سکتی ہے اور چونکہ حق تعالیٰ کی طرف رجعت اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ[1]، ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ[2]، وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ[3]، ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ[4] کے ماتحت ہماری زندگی کا اصل مقصد ہے اس لیے ہر فطرت سلیم میں اس کی محبت کا موجود ہونا ایک طبعی امر ہے ؎

ہیچ آگہی نہ بود زعشق و وفا مرا — خود ریختی متاعِ محبت بدامنم

---

[1] بقرہ: ۱۵۶ ۔ [2] انعام: ۱۶۵ ۔ [3] آل عمران: ۲۸ ۔ [4] سجدہ: ۱۲ ۔

یعنی مجھے عشق وفا کی کچھ بھی خبر نہ تھی، تو نے ہی خود محبت کی پونجی میرے دامن میں ڈال دی - اور قرآن پاک میں یہ جو فرمایا ہے کہ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ[1] وہ بھی انسان کی فطرت کے اسی خاصہ کا اظہار ہے کیونکہ دل کا حقیقی سرور اور اطمینان اپنے پیدا کرنے والے کی یاد اور عبادت میں ہی مضمر ہے اور عبادت ہرگز کسی قسم کی بیگار یا چٹی نہیں، کیونکہ حق تعالےٰ بندوں کی پرستش سے بکلّی بے نیاز ہے اور اُسے ہماری حمد و ثنا کی قطعاً کوئی حاجت نہیں یہ تو صرف ہمارے لیے خود کو پاک کر کے اس کا قرب حاصل کرنے کا ایک وسیلہ ہے ؎

ہر سرائے را چراغے ہست صائب در جہاں
سینہ و دل روشن از نورِ عبادت می شود

ایسی دنیا میں جس طرح گھر کے اندر روشنی کرنے کے لیے ایک چراغ کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح انسان کا دل اللہ تعالےٰ کی عبادت سے روشن ہوتا رہتا ہے۔

الغرض اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ دنیا کی سب کامیابیاں، سب دولتیں، سب عزّتیں، سب ترقیاں حاصل کر لینے کے بعد بھی انسان اپنی سچی خوشی اور راحت ان میں نہیں پاتا،

---

[1] رعد: ۲۹

کیونکہ حقیقی چین و قرار دنیا کی دولت اور اس کی عزّت میں نہیں بلکہ اُس سکینتِ قلب میں ہے جو خالق سے محبّت اور اس کی عبادت کے نتیجہ میں انسان کو ملتا ہے اور ایسے کیوں نہ ہو، جب اسے خلق ہی اس صورت سے کیا گیا ہے کہ اس کا دل تختِ رب العالمین بنے۔

نہ ہو طغیانِ مشتاقی تو مَیں رہتا نہیں باقی
کہ میری زندگی کیا ہے یہی طغیانِ مشتاقی

غور اور تجزیہ کرنے پر محبّت کے چار اسباب یا محرکات نظر آتے ہیں:-

اوّل : حُسن
دوم : احسان
سوم : کمال
چہارم : محبّتِ نفس

ہم ان میں سے ہر ایک کو باری باری لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ یہ کس منطقی نتیجہ پر ہم کو پہنچاتے ہیں اور ان کی روشنی میں یہ معلوم کرتے ہیں کہ کیا حق تعالیٰ کی طرح کوئی دوسرا وجود ہماری محبت کا ویسا حقدار ہو سکتا ہے اگر نہیں تو پھر متذکرہ بالا تینوں گروہ یقیناً گم گشتہ منزل اور جادۂ مستقیم سے دُور ہیں۔

۱- محبت کا سب سے پہلا سبب حُسن ہے، حُسن بالطبع انسان کو مرغوب ہے - یہ ناممکن ہے کہ حُسن ہو اور اپنا اثر نہ کرے زبان جس طرح شیریں اور کڑوی اشیاء میں فرق کرتی ہے یعنی میٹھی کی طرف رغبت اور کڑوی سے نفرت، اسی طرح انسان حسین شے کی طرف کشش محسوس کرتا ہے اور کریہہ سے نفرت، حسن خواہ انسانوں میں ہو یا مناظرِ قدرت میں الغرض جہاں بھی ہو اور جس شے میں بھی ہو لازماً اپنا اثر دکھائے گا - کیا سبزہ اور آبِ رواں دیکھ کر ہم کو لذّت اور راحت نہیں ہوتی یا ایک حسین و جمیل چہرہ دیکھ کر دل خوش نہیں ہوتا اور یہ تو صاف ظاہر ہے کہ عالم کی جملہ اشیاء کا حسن از خود نہیں بلکہ خالق کا پیدا کردہ ہے اور جب بات یہ ہے تو اس میں کیا شک ہو سکتا ہے کہ جس ذات نے یہ سب حسن پیدا کیا ہے وہ خود کس درجہ حسین و جمیل ہو گی - الغرض اسی عالم میں حسن کا وجود خالق کے بے مثل اور بے مانند حسن پر ایک کامل دلیل ہے کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ وہ حسن کو تو خلق کرے لیکن خود اسی سے محروم ہو، دوسروں کو حسن بخشنے والا بھلا خود کس درجہ حسین نہ ہو گا؟ کیا دوسروں کو غنی کرنے والا خود فقیر ہو سکتا ہے اور کیا ایک فقیر کسی کو غنی کر سکتا ہے؟

ع کے فقیرِ بے نوا گوید کہ گیر

یعنی ایک مفلس اور قلاش جس کا اپنا دامن خالی ہے کس طرح
کسی دوسرے کو کچھ دے کر یہ کہہ سکتا ہے کہ لو یہ لے لو۔
اگر دنیا کی حسین و جمیل اشیاء کا حُسن ہم کو اپنی طرف کھینچتا
ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ حُسنِ ازل (جس سے دنیا میں نظر
آنے والا سب حسن مستعار ہے) ہم کو اپنی طرف نہ کھینچے۔

حُسنِ تو غنی کند زِ ہر حُسن — مہرِ تو بخود کشد ز ہر یار
حُسنِ نمکینت ار نہ بودے — از حُسن تو نہ بودے ہیچ آثار
شوخی ز تو یافت روئے خوباں — رنگ از تو گرفت گُل بگلزار
سیمیں ذقناں کہ سیب دارند — آمد ز ہماں بلند اشجار

ایں ہر دو ازاں دیار آئند
گیسوئے بتان و مشکِ تاتار

یعنی تیرا حسن ہر حسن سے بے پروا کرتا ہے اور تیری محبّت
ہر دوست کو چھڑا کر اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اگر تیرا نمکین
حسن نہ ہوتا تو دنیا میں حسن کا نام و نشان نہ ہوتا۔ معشوقوں
کے چہروں نے تجھ سے شوخی پائی اور پھول نے چمن میں
تجھ سے رنگ حاصل کیا۔ سیمیں ذقنوں کے پاس جو سیبِ رخسار ہیں، یہ اُنہیں
اُونچے درختوں سے آئے ہیں، یہ دونوں بھی اسی ملک سے آتے ہیں۔ یعنی

بتوں کی زلفیں اور تاتار کا مشک۔

یہ حُسنِ ازل کی ایک جھلک تھی جس کا ذیل کے اشعار میں بیساختہ اظہار ہے:۔

کس قدر ظاہر ہے نور اس مبدء الانوار کا ۔۔۔ بن رہا ہے سارا عالم آئینہ ابصار کا

چاند کو کل دیکھ کر میں سخت بے کل ہو گیا ۔۔۔ کیونکہ کچھ کچھ تھا نشاں اس میں جمالِ یار کا

اس بہارِ حُسن کا دِل میں ہمارے جوش ہے ۔۔۔ مت کرو کچھ ذکر ہم سے تُرک یا تاتار کا

چشمۂ خورشید میں موجیں تری مشہود ہیں ۔۔۔ ہر ستارے میں تماشہ ہے تری چمکار کا

خُوبرویوں میں ملاحت ہے ترے اس حُسن کی ۔۔۔ ہر گل و گلشن میں ہے رنگ اس ترے گلزار کا

چشمِ مستِ ہر حسیں ہر دم دکھاتی ہے تجھے ۔۔۔ ہاتھ ہے تری طرف ہر گیسوئے خمدار کا

یا اسی طرح چودھویں کا چاند کچھ دوسرے دلوں کو تمام رات حسن ازل کی یاد میں یوں ڈوبا ہُوا رکھتا ہے:۔

کل چودھویں کی رات تھی ۔۔۔ شب بھر رہا چرچا ترا

کچھ نے کہا یہ چاند ہے ۔۔۔ کچھ نے کہا چہرہ ترا

اگر ہمارے سینہ میں دلِ آگاہ ہے تو جہاں بھی حسن کی جلوہ گری ہو گی کم و بیش کچھ ایسی ہی کیفیت سے ہم بھی دوچار ہوں گے

جس کے سینہ میں دلِ آگاہ ہے

اس کے لب پر اللہ ہی اللہ ہے

ہاں یہ الگ بات ہے کہ روحانی بینائی اور بصارت سے محرومی کے باعث حسن کی آغوش میں ہو کر ہم بہائم کی طرح نہ تو اس

سے متاثر ہوں اور نہ ہی حسن فانی ہم کو حُسنِ حقیقی کی طرف مائل
کرے لیکن حقیقت یہ ہے کہ حسن و عشق کا ازلی اور فطری تعلق
ہے، جہاں حسن ہو گا وہاں عشق لازماً ہو گا اور حق تعالےٰ سے
بڑھ کر کوئی حسین و جمیل نہیں :-

اک عکسِ ناتمام پہ عالم کو وجد ہے
کیا پوچھنا ہے آپ کے حسن و جمال کا

اگر وہ بے نقاب ہو کر اپنی جھلک دکھا دے تو تمام مخلوق اس
کے حسن کی تاب نہ لا کر غش کھا کر گر پڑے ۔ اور اس دنیا میں وہ
ہم کو اس وجہ سے نظر نہیں آتا کہ وہ لطیف ہے اور ہم کثیف
ہیں اور کثیف لطیف کو بھلا کیوں کر دیکھ سکے :-

وہ اپنے حسن کی مستی سے ہیں مجبور پیدائی
مری آنکھوں کی بینائی میں ہیں اسباب مستوری

لیکن ہر وہ شخص جو اس کے دیدار کی تمنّا رکھتا ہے اور اس کے
ساتھ اس کے لیے کوشاں بھی ہے وہ عالمِ آخرت میں ضرور
اس کے دیدار سے مشرّف ہو گا کیونکہ حقیقت میں یہی وہ اصل
مقصد ہے جس کو پانے کے لیے انسان کو خلق کیا گیا ہے.
انسانی فطرت میں جو حسن و جمال کی کشش رکھی گئی ہے ، وہ اسی
غرض سے ہے ۔ اس لیے انسان یقیناً اپنی ارتقائی منازل طے

کرتا ہوا بالآخر حسنِ ازل کے جلووں سے لذّت اندوز ہوگا۔

آدمی دید است باقی پوست است
دید آں باشد کہ دیدِ دوست است

یعنی آدمی کی حقیقت دیدار اور دیدار سے مراد دوست یعنی خدا کا دیدار ہے اس کے علاوہ آدمی جو کچھ ہے وہ صرف ایک چھلکا ہے۔ اور قرآن پاک کی آیت وَاعْلَمُوْا اَنَّکُمْ مُلٰقُوْہُ[1] اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

رسول پاک (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی فرمایا ہے فَیُرْفَعُ الْحِجَابُ فَیَنْظُرُوْنَ اِلٰی وَجْہِ اللّٰہِ فَمَا اُعْطُوْا شَیْئًا اَحَبَّ اِلَیْھِمْ مِنَ النَّظَرِ اِلٰی رَبِّھِمْ۔ یعنی پھر جب حجاب اُٹھا دیا جائے گا تو مومن لوگ اللہ کا جلوہ دیکھیں گے پس ان کو جس قدر نعمتیں دی جائیں گی ان میں سے ان کو اپنے پروردگار کے دیدار سے بڑھ کر کوئی چیز مرغوب نہیں ہوگی (مشکوٰۃ)

اس عالم میں حق تعالےٰ کے نظر نہ آسکنے کے سلسلہ میں یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ کسی شے کا پتہ اس کی ضد سے ہی لگتا ہے مثلاً اگر دنیا میں ہمیشہ دن ہی رہتا اور رات کا کچھ نشان نہ ہوتا تو ہم کو دن کا قطعاً کچھ پتہ نہ لگتا، دن کا علم محض رات

---

[1] بقرہ: ۲۲۴

کی وجہ سے ہے جو اس کی ضد ہے، لیکن حق تعالیٰ کی کوئی ضد نہیں، ہر جگہ اس کی ہی ذات کا نُور و ظہور ہے اور جب حقیقت یہ ہے تو پھر کس ضد کے ذریعہ وہ نمایاں اور ظاہر ہو یہی وجہ ہے کہ باوجود اس قدر ظاہر و باہر ہونے کے اس کی ذات نہاں در نہاں ہے اور اس کا حسن چھُپا ہوا اور مستور ہے۔

کیا کھُلے جو کبھی نہ تھا پنہاں
کیا ملے جو کبھی جدا نہ ہُوا

قرآن پاک میں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی درخواست رؤیتِ باری تعالیٰ اور آپ کی بے ہوشی کا ذکر ہے وہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ خداوند تعالیٰ کے حسنِ عالمتاب کی تجلّی کی تاب ناممکن ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام جیسا عظیم الشان نبی بھی جب کشفی رنگ میں حسنِ ازل کی ایک جھلک دیکھتا ہے تو غش کھا کر گر پڑتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن ضرب المثل تھا اور یہ ان کے حسنِ دل افروز کا ہی اثر تھا کہ ان کو دیکھ کر زنانِ مصر اس قدر وارفتہ ہوگئیں کہ کھانے کی چھُریاں کھانے کی بجائے ہاتھوں پر مار لیں اور بے اختیار ہو کر پکار اُٹھیں کہ یہ تو انسان نہیں بلکہ فرشتہ ہے۔ الغرض کون ہے جو حسن پر فریفتہ نہ ہوگا اور جب حسن فانی کی کشش

کا یہ عالم ہے تو حسنِ ازل کا کیا کہنا :-

فکرم بمنتہائے جمالت نمی رسد

کز ہر چہ درخیالِ من آید نکوتری

یعنی میری عقل تیرے جمال کے انتہا تک نہیں پہنچ سکتی کیونکہ جہاں تک بھی میرا خیال پہنچتا ہے تو اس سے بھی زیادہ حسین ہے۔

یہاں ایک وسوسہ کا ازالہ بھی ضروری ہے حق تعالیٰ کے حسن کے سلسلہ میں کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ حق تعالیٰ جسم سے پاک ہے اور نہ ہی اس کا حسن جسمانی آنکھوں سے نظر آ سکتا ہے تو پھر اس کی طرف کشش کیونکر ممکن ہو، اس کا جواب یہ ہے کہ حسن و جمال صرف ظاہری شکل و صورت، عشق و محبت، جوانی اور جسمانی خوبصورتی پر منحصر نہیں یعنی حُسن صِرف جسم کی خوبصورتی کا ہی نام نہیں یہ تو صرف وہ شخص ہی کہے گا جس کی عقل خام ہے ایسا شخص اعضاء کی اعلےٰ مناسبت، چہرہ کی شادابی اور گالوں کی سُرخی کو ہی حسن سمجھتا ہے، لیکن اصل حقیقت یہ نہیں مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شہر بڑا خوبصورت ہے یا فلاں نغمہ بڑا پُر کیف ہے یا فلاں تصویر بڑی پُرکشش ہے تو چہرہ کی شادابی، گالوں کی سُرخی اور اعضاء کی مناسبت اور موزونیت کا ان اشیاء سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا

لیکن پھر بھی یہ اشیاء خوبصورت کہلاتی ہیں دوسرے الفاظ میں جب ہم کسی شے کو خوبصورت کہتے ہیں تو ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ جس قسم کا کمال اور خوبی اس شے کے لائق ہے وہ سب اس میں بدرجۂ کمال موجود ہے۔

اب غور کریں تو صاف نظر آتا ہے کہ جملہ کمالات جو حق تعالےٰ کی شان کے شایاں ہیں وہ سب کے سب بدرجۂ اتم اس کی ذات میں موجود ہیں۔ صرف وہی ہے جو تمام صفات حسنہ سے متصف اور ہر قسم کے نقائص سے پاک ہے۔ وہ ایک ہے اور کوئی اس کا شریک نہیں وہ قادرِ مطلق ہے۔ وہ رحمان ہے یعنی بغیر مانگے اور بغیر کسی عمل کے دیتا ہے۔ وہ رحیم ہے، یعنی عملوں کا پورا پورا بدلہ دیتا ہے۔ وہ سب عالمین کا رب ہے اور ادنیٰ سے اعلیٰ اور ناقص سے کمال تک پہنچانا صرف اسی کی صفت ہے۔ سب جزا سزا اسی کے ہاتھ میں ہے عالم کا ذرّہ ذرّہ اس کے فیض سے سیراب ہے۔ وہ بے نظیر ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ کسی نے اسے پیدا نہیں کیا لیکن اس نے ہر شے کو پیدا کیا ہے، وہ خود سے قائم ہے لیکن باقی ہر شے اس کے سبب قائم ہے۔ اگر وہ آج اپنا ہاتھ کھینچ لے تو ہر شے فنا ہو جائے۔ فنا و

زوال کو اس کی درگاہ میں گذر نہیں، لیکن اس کے سوا ہر شے فانی ہے۔ وہ غنی ہے اور اسے کسی شے کی حاجت نہیں، لیکن اس کے سوا سب محتاج اور فقیر ہیں۔ وہ سب کو رزق بخشتا ہے، لیکن خود کھانے پینے سے بے نیاز ہے، زمین و آسمان کی ہر شے پر اس کی حکومت ہے لیکن وہ خود ہر قید و بند سے آزاد ہے۔ وہ سمیع ہے، وہ بصیر ہے، اس سے کوئی شے پوشیدہ اور چھپی ہوئی نہیں، ماضی، حال اور مستقبل سب اس کے لیے برابر ہیں، اس کے کاموں میں کسی کو دخل نہیں، لیکن اس کے حکم کے بغیر ایک پتّا بھی حرکت نہیں کر سکتا، وہ زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہے، وہ تمام کائنات کا منبع اور سرچشمہ ہے، وہ حکیم ہے، وہ صاحبِ ارادہ ہے، اس کی قدرت بے انتہا ہے، اس کا علم کامل ہے، اس کی رحمت ہر شے پر محیط ہے، اس کے عفو کو اس کے غضب پر سبقت ہے، اس کا کرم بے پایاں ہے، اس کا رحم بے حد ہے، اس کی بخشش بے سبب ہے۔

اگرچہ اس کی حقیقی صفت رحمت ہی ہے جس کا جملہ عالمین میں ہر لمحہ ظہور ہے لیکن وہ صاحبِ جلال بھی ہے کیونکہ اگر وہ اپنا حکم ماننے والوں اور نہ ماننے والوں سے ایک ہی سا سلوک کرے تو یہ ضعف کی علامت ہو گی۔ وہ ہر لحظہ نئی شان میں ہے

جواد یعنی حقیقی محسن صرف اسی کی ہی ذات ہے کیونکہ اس کے سوا باقی سب دینے والے یا تو آخرت کے ثواب یا دنیا کی تحسین کے سبب دیتے ہیں اور جو دیتے ہیں اُن کا دینا بھی صرف حق تعالیٰ کی امانت میں سے ہے، اگر وہ ان کو نہ دیتا تو کہاں سے دیتے، وہ امن دینے والا ہے ، وہ تمام آفات سے بچانے والا ہے، وہ ہی سب کا نگہبان ہے، وہ غالب ہے، وہ ہی ہمارے نقصانوں کی تلافی کرنے والا ہے ، وہ بار بار رحم کرنے والا ہے، کبریائی اس کی شان ہے ، بندوں کی پردہ پوشی اسی کی صفت ہے، وہ ہی سب کا مشکل کشا ہے، عزّت و ذلّت صرف اسی کے ہاتھ میں ہے، اسی طرح اُونچا اور نیچا بھی وہ ہی کرتا ہے۔ سچا فیصلہ اور سچا عدل صرف اسی کا ہے، وہ نہایت درجہ باریک بین ہے، وہ ہی حقیقی قدر دان ہے۔ سب عظمت اور بڑائی صرف اسی کو حاصل ہے، وہی سب کی نگرانی کرتا ہے، وہی سب کا حافظ و ناصر ہے، وہ ہی انسانوں کی دعاؤں اور عملوں کو قبول کرنے والا ہے، وہ بڑا ہی محبت کرنے والا ہے ، وہ ہی ہر کمال کا دائمی اہل ہے، وہی ظاہر ہے اور وہی باطن ہے، وہ ہی اوّل ہے اور وہی آخر ہے، وہ غفار یعنی بخشش کرنے والا ہے، وہ غفور یعنی بخشنے والا ہے، وہ ہی سب کچھ عطا کرنے والا ہے، وہ بڑا

ہی بُردبار ہے، وہ بندوں کی گستاخی پر صبر کرنے والا ہے، وہ ہی بندوں کے حال پر رجوع برحمت ہونے والا ہے، وہ ہی سب اچھے ناموں کا مالک ہے۔ رسولِ پاکؐ نے یہ ننانوے گنائے ہیں، لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ حق تعالیٰ کی ذات صرف انہی ننانوے اسمائے حسنہ سے متصف ہے و بس، یہ تو صرف ہم خاک کے مکینوں کے ظرف اور نسبت سے اس کی تجلّیات اور جلوہ گری کا بیان ہے ورنہ جو ذات بے حد و عد ہو اس کی صفات اور اسماء حسنہ کا شمار بھلا کب ممکن ہے ۔

ہرچہ آید بفہم و عقل و قیاس
ذاتِ او برتر است زاں وسواس

یعنی جو کچھ فہم و عقل اور قیاس میں آ سکتا ہے اس کی ذات ہر اس خیال سے برتر ہے۔

اب خود ہی فیصلہ کیجیے کہ کیا ان اوصاف سے متصف ذات ہماری محبّت اور پرستش کی حقدار نہ ٹھہرے گی اور ہم اس پر دل و جان سے فدا نہ ہوں گے؟ اور کیا اس کے سوا کوئی اور اس جیسا ہے جو ہماری محبت کا ویسا حقدار ہو؟ یہاں ایک اور شبہ کا ازالہ بھی ضروری ہے ۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تو مانا کہ سب اشیاءٔ کا حُسن صرف آنکھ سے نظر نہیں آتا ۔ نغمے کے حسن کا تعلق مثلاً کان

سے ہے لیکن اس کا علم تو بہر حال سُننے کی حِس کے ذریعہ سے ہی حاصل ہوتا ہے، اس لیے ان اشیاء کے حسن و جمال کا کیسے تصوّر کیا جائے جن کا تعلق ہماری کسی بھی حِس سے نہیں یعنی نہ دیکھنے سے نہ سُونگھنے سے نہ چُھونے سے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ حسن و جمال صرف حِسّوں سے ہی محسوس ہونے والی اشیاء میں مقید نہیں بلکہ غیر محسوس میں بھی پایا جاتا ہے، کیا ہم یہ نہیں کہتے کہ فلاں شخص میں بہت ہی حُسنِ خلق ہے اور کیا اچھے اور عمدہ اخلاق کا حواسِ خمسہ سے علم ممکن ہے؟ بالکل نہیں، ان کے علم کا تعلق ہماری اندرونی بصیرت سے ہے نہ کہ بصارت سے اور اچھے اخلاق ہر ایک کو محبوب ہیں اور جو ان کا حامل ہوگا قدرتی طور سے سب کا محبوب ہوگا۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیوں حق تعالیٰ سے محبت کے جذبہ کو انسان کے دل میں بطور ایک بیج کے رکھا گیا ہے اور کیوں اسے دوسری انسانی جبلّتوں کی طرح اضطراری رنگ نہیں دے دیا گیا تا اس سے انحراف ممکن ہی نہ ہوتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس شے کی ترقی مقصود ہو اس کا بیج کی صورت میں ہونا لازمی ہے کیونکہ بیج کے اندر پھلنے پھُولنے اور بڑھنے کی استعداد ہوتی ہے۔ خوراک کی خواہش یعنی بھوک انسان کے اندر بطور ایک اضطراری تقاضا

گئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بھوک کے تقاضا کا
سو و نما مطلوب نہیں اور یہی بات دوسری سب انسانی جبلتوں کے
متعلق درست ہے، لیکن محبتِ الٰہی کے جذبہ کی ترقی کی منازل بے انتہا
ہیں اس لیے اس کا بطور ایک بیج کے ہونا ضروری تھا۔اس کے
علاوہ ایک دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ کسی جبلت کا اظہار انسان
کے لیے کسی قسم کی خوبی اور کمال کا باعث نہیں بن سکتا اور نہ
ہی اس پر کوئی انعام یا اجر مرتب ہو سکتا ہے ، صاف ظاہر
ہے کہ انعام صرف دوڑ میں حصّہ لینے اور اس میں آگے نکل جانے
پر ہی ملا کرتا ہے۔کیا کبھی کسی مشین یا اس کے کل پُرزے کے
متعلق یہ خیال بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس کو انعام دیا جائے کیونکہ
اس نے اپنا کام بہت خوبی سے سرانجام دیا ہے؟

دوسرا سبب محبّت کا احسان ہے اگر آپ پر کوئی شخص
احسان کریگا تو ظاہر ہے کہ آپ کے دل میں قدرتی طور پر اس کی
محبت پیدا ہو گی۔مثل مشہور ہے کہ انسان بندۂ احسان ہے، وحشی
جانور تک بھی احسان شناسی سے محروم نہیں۔تاریخ کئی مثالیں
پیش کرتی ہے کہ خوفناک اور خونخوار درندوں تک نے اپنے
محسن کو پہچان لینے پر فوراً اپنے احسان شناسی کے جذبہ کا
اظہار کیا ، انسان ہو کر اگر احسان شناسی میں ہم درندوں سے بھی

کم ہوں تو پھر ہمارے حیوان ہونے بلکہ حیوانوں سے بھی کم تر ہونے
میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ اگرچہ حق تعالیٰ کے احسانوں کا شمار
تو ممکن نہیں :-

عنایت ہائے اورا چوں شمارم
کہ لطفِ اوست بیروں از شمارے

یعنی اس کی مہربانیوں کو کیوں کر گنوں کہ اس کی مہربانیاں تو حد و شمار
سے زیادہ ہیں، لیکن آئیے پھر بھی ہم یہ جاننے کی سعیِ لاحاصل
کریں کہ ہماری گردن حق تعالیٰ کے کن عظیم احسانوں تلے دبی ہوئی
ہے اور ہم پر اس کے کس کس نوع کے کیا کیا احسان ہیں -

پہلی بات جو نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارا وجود اور
ہماری ہستی سرتاپا اس کے دستِ فیض کی مرہونِ منّت ہے،
اگر وہ ہم کو لذّتِ ہستی نہ بخشتا تو ہمارا کوئی وجود نہ ہوتا :-

بادِ ما و بُودِ ما از دادِ تُست
ہستیٔ ما جملہ از ایجادِ تُست

یعنی ہمارا وجود تیری عطا ہے ہم سب کی ہستی تیری
ایجاد ہے -

انسان ذرا اپنی ذات پر تو غور کرے ایک وقت تھا کہ اس
کا نام و نشان تک نہ تھا پھر وہ محض ایک خورد بینی ذرّہ تھا لیکن

خالق کی معجز نمائی نے اسے ایک جیتا جاگتا انسان بنایا۔ ع

کرمکے بودم مرا کردی بشر

یعنی میں ایک حقیر کیڑا تھا تو نے مجھے بشر بنا دیا اور یہ سب کچھ بغیر کسی سبب یا طلب کے

ما نہ بودیم و تقاضہ ما نہ بود
لطفِ تو ناگفتۂ ما می شنود

یعنی جب ہم موجود بھی نہ تھے اور ہمارا تقاضا بھی نہ تھا تو تو نے بے مانگے ہم کو دولتِ وجود عطا کی اور جن جن حاجات کا ہم اظہار بھی نہ کر پائے تھے تو نے خود ان کو سمجھ کر پورا کر دیا۔

تری عطا ہے میری احتیاج سے پہلے
کبھی سوال کی نوبت نہ تو نے آنے دی

ہم کو نیستی سے ہست کرنے کے بعد جس جود و سخا کی ہم پر بارش ہوئی ہے اس کا تو کچھ ٹھکانہ ہی نہیں۔ رحمِ مادر کے اندر ہماری جملہ ضروریات (جبکہ ہم کو اپنی کچھ بھی خبر نہیں تھی) جس درجہ مہر و کرم سے پوری کی جاتی ہیں ہر انسان آسانی سے خود ان کا تصوّر کر سکتا ہے، پھر ہماری پیدائش کے بعد جبکہ ہم بے بسی اور ناتوانی کی مجسّم تصویر ہوتے ہیں رحمتِ خداوندی ماں باپ کی فطری محبت کے رنگ میں جس طرح ہماری خبر گیری اور پرورش کرتی

ہے وہ حد درجہ حیرت انگیز ہے، گوشت کا ایک تھرکتا ہوا لوتھڑا
پیدا ہوتے ہی ماں باپ کی مشفقانہ توجہ کا مرکز بن جاتا ہے، خود
ہزار دُکھ اور تکلیف جھیل کر اس کو آرام پہنچاتے ہیں اور اسی
میں وہ اپنی حقیقی خوشی اور راحت محسوس کرتے ہیں۔ کیا کوئی
انسان یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس کی پیدائش کے بعد ماں باپ
کی طرف سے اس کی پرورش میں جس بے غرضی کا مظاہرہ ہوتا ہے
وہ اس کے کسی حق یا کسی عمل کا نتیجہ ہے؟ ہرگز نہیں! پھر اس عالم
میں ہمارے سفر کے شروع ہوتے ہی کس طرح ہماری سب ضروریات
اور حاجات پورا کرنے کا ایک پُر حکمت سلسلہ خالق کی طرف سے
ہمارے لیے پہلے سے تیار موجود ہوتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے
ایک حد سے زیادہ متواضع میزبان اپنے مہمان کی آمد سے قبل اس
کی خاطر و مدارات کے لیے ہر قسم کے سامان مکمل کر رکھے۔ ہماری پیدائش
کے معاً بعد ہم کو چونکہ بڑی ہی لطیف غذا کی ضرورت تھی، اس
لیے شیرِ مادر کا اہتمام ہماری پیدائش کے ساتھ ہی فوراً ظہور میں
آجاتا ہے اور پھر یہ کس قدر حیرت انگیز بات ہے کہ جوں جوں
وقت گذرتا جاتا ہے یہی شیرِ مادر جو شروع میں بہت ہی پتلا تھا
(کیونکہ ہمارا معدہ ثقیل دودھ ہضم ہی نہ کر سکتا تھا) آہستہ آہستہ
بھاری اور بوجھل ہوتا جاتا ہے یعنی پانی کم اور غذائیت زیادہ

کیا کبھی کسی نے یہ سوچا بھی ہے کہ کہاں کائنات کو خلق کرنے والی جبروت اور کبریائی کی مالک ذات کہ جس کے تصوّر سے ہی دل ہیبت اور خشیت سے لرز ہو جائیں اور کہاں ایک جانِ ناتواں ، لیکن اس پر ذرّہ نوازی کا یہ عالم کہ اس کے دنیا میں وارد ہوتے ہی اس کی حاجت براری کے سب سامان کمال التزام سے نہ صرف موجود بلکہ اس کی بدلتی ہوئی ضروریات سے مکمل طور سے ہم آہنگ۔

زندگی کے لیے انسان کو کیسے موزوں اور مناسب قوئے عطا کیے گئے ہیں۔ دیکھنے کے لیے آنکھیں، سُننے کے لیے کان، چکھنے کے لیے زبان ، سُونگھنے کے لیے ناک ، کام کرنے کے لیے ہاتھ، چلنے پھرنے کے لیے ٹانگیں اور غور و فکر کرنے کے لیے دماغ۔ یہ سب طاقتیں خالق کے ہم پر عظیم انعام ہیں ، لیکن شاید غفلت کے باعث کبھی ہم نے اس کا احساس بھی نہیں کیا۔ ان میں سے اگر ایک بھی طاقت کسی بیماری کی وجہ سے عارضی طور سے ہم سے چھن جائے تو پھر اس کی اصل قدر و قیمت کا پتہ لگے مثلاً چلنے پھرنے کی طاقت کا کتنے لوگ شکر ادا کرتے ہیں ، لیکن اس کی قدر ذرا اس شخص سے پوچھو جو اس سے محروم ہے۔

اے خدا احسانِ تو اندر شمار   می نتانم بزبانِ صد ہزار

جان وگوش وچشم وہوش وپاؤ دست　　جملہ از دُرہائے احسانت پُراست

یعنیٰ اے خدا تیرے احسان بے شمار ہیں جن کا ایک لاکھ زبانیں بھی شکر ادا کریں تو نہ کر سکیں۔ میری جان، میرے کان، میری آنکھیں، میرے ہوش و حواس اور میرے ہاتھ پاؤں یہ سب آپ کے احسان کے موتیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔

فرض کرو کسی دور دراز ملک میں رہنے والا ایک شخص اپنے بہت سے خادم ہمارے پاس اس غرض سے بھیج دے کہ وہ ہر آن ہماری خدمت میں مصروف رہیں اور اپنی خدمت گذاری پر ہم سے قطعاً کوئی صلہ یا اجر نہ لیں اور باوجود انتہائی کوشش ہم اس محسن کے احسان کا رتی بھر بدلہ بھی نہ چُکا سکیں، آپ خود ہی کہیے کہ ایسے محسنِ عظیم کے لیے آپ کے دل میں کیا جذبات پیدا ہوں گے اور کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی سب طاقتیں اور اعضاء وہ غلامِ بے دام ہیں جو خالق نے دن رات آپ کی خدمت پر مامور کر رکھے ہیں:-

صد منّتِ تو ہست بریں مشتِ خاکِ من
جانم رہینِ لطفِ عمیمِ تو ہم تنم

یعنی میرے اس وجود پر جو خاک کی ایک مُٹھی ہے تیرے سینکڑوں احسان ہیں۔ میری جان بھی تیری عالمگیر مہربانیوں کی ممنون ہے

اور میرا جسم بھی۔

ہماری پیدائش کے بعد جس طرح خالق کی ربوبیت ہم کو اپنی آغوش میں لیتی ہے اس کا تصوّر حد درجہ وجد آفرین ہے۔نو کروڑ میل کی دُوری سے سُورج اپنی روشنی اور گرمی سے ہماری زندگی کو ممکن بناتا ہے۔زمین اپنی گردش سے دن، رات اور مختلف موسم مہیّا کرتی ہے۔سورج ،سمندر، ہوا، پہاڑ یہ سب مل کر ہماری زمین کی سیرابی و شادابی کا باعث بنتے ہیں۔ ذرا پانی سے لدی ہوئی ان ہواؤں پر غور کرو کہ کس طرح سمندر کا کھاری پانی سورج کی گرمی سے کشید ہو کر ان کے کندھوں پر سوار ہم تک پہنچتا ہے اور اسی طرح وہ آبِ حیات جس پر سب زندگی کا دار و مدار ہے کس حکیمانہ نظام کے تحت ہزاروں میل دور سے ہم تک اُمڈا چلا آتا ہے۔قریب کے کنوئیں یا محلہ کے نل سے پانی کی ایک مشک جو سقّہ لاتا ہے اس کی قیمت کو ذہن میں رکھ کر ذرا حساب تو لگاؤ کہ بارش جو سارا سال ہم پر برستی ہے اس کی لاگت کیا ہو گی۔ سعدی نے کیا خوب کہا ہے:

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

ہمہ از بہرِ تو سرگشتہ و فرماں بردار شرطِ انصاف نباشد کہ تو فرماں نہ بری

یعنی بادل ہوا چاند سورج اور آسمان سب کو خدا نے مامور کیا ہُوا

ہے کہ تا تجھے تیری زندگی کے لیے رزق کی فراہمی بروئے کار لائیں اور تُو ان عنایاتِ خداوندی کے لیے اس کے شکر سے غافل نہ ہو، اے بندۂ خدا! سب موجودات اللہ نے تیری خدمت کے لیے پیدا فرمائی ہیں اور یہ انصاف نہ ہوگا کہ تو اللہ کا فرمانبردار نہ بنے۔

زمین میں مدفون اَن گِنت معدنیات ہزار رنگ میں ہمارے کام آتی ہیں، دَورِ حاضرہ کی صنعتی تہذیب اور آج کے انسان کی ترقی کہ ہواؤں اور سمندروں کو مسخر کرنے کے بعد وہ چاند تک جا پہنچا ہے ان مخفی خزانوں کے بغیر ہرگز ممکن نہ تھی اور خشکی میں مدفون خزائن کے مقابلہ میں سمندروں کی تہہ میں جو خزائن ہمارے لیے محفوظ پڑے ہیں ان کا تو کوئی حد و حساب ہی نہیں، کیونکہ کرّۂ ارضی میں خشکی ایک حِصّہ اور تری تین حصّے ہے اس حساب سے تو یہ تین گنا زیادہ ہونے چاہئیں لیکن حقیقت میں یہ اس نسبت سے کہیں زیادہ ہیں اور ان کی اقسام کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔ غربت کے خلاف موجودہ مشینی دَور کی جنگ جس محیّر العقول کامیابی سے ہمکنار ہوئی ہے وہ بھلا کیا زمین کے ان چھپے ہوئے خزانوں کے بغیر ممکن تھی؟ مغرب کا مادّہ پرست انسان جو اپنی ترقی پر بڑا نازاں ہے کیا اس نے کبھی غور نہیں کیا کہ اگر زمین اپنے خزانوں سے تہی ہوتی تو اس کا معیار زندگی جس

بامِ رفعت پر پہنچا ہے وہ بھلا کب ممکن تھا اور پھر جس عقل نے یہ سب کچھ سر انجام دیا ہے وہ کس کی پیدا کردہ ہے ؛

انسان ذرا اپنی خوراک کو ہی دیکھیے ، پیٹ بھرنے اور زندہ رہنے کے لیے اس قدر مختلف النّوع اور مختلف الذائقہ کھانے پینے والی اشیاء کی بھلا کب ضرورت تھی یہ تو محض خالق کا لطفِ عمیم ہی ہے کہ اپنی نعمتوں کا اتنا وسیع دسترخوان ہمارے لیے چُن دیا ہے ۔ اناج ہے تو قسما قِسم کا ، سبزیاں اور ترکاریاں ہیں تو طرح طرح کی ، گوشت ہے تو انواع و اقسام کا ، پھل ہے تو رنگا رنگ کا اور ہر موسم کا الگ الگ ہے ۔ چوپائے اگر اپنے دودھ سے ہماری لذت کا سامان بہم پہنچاتے ہیں ، تو شہد کی مکّھیاں پھولوں سے ہمارے لیے شیرینی جمع کرنے میں مصروف ہیں ۔ الغرض ہماری لذتِ کام و دہن اور ہماری شکم پروری کے لیے خالق نے اپنے لطف و کرم کا وہ مظاہرہ کیا ہے کہ سوچ کر انسان کا دل شکر کے جذبات میں ڈوب جاتا ہے ۔ پھر خالق نے ہمارے لباس اور پوشاک کے لیے طرح طرح کی اشیاء پیدا کر رکھی ہیں ، اگر کپاس کے سُوت کے نرم اور ملائم ملبوسات گرمیوں میں ہمارے آرام و زینت کا باعث بنتے ہیں تو اُون سے تیار کردہ کپڑے سردیوں میں ہم کو سردی سے بچاتے

ہیں، ریشم کا کیڑا اپنا لُعاب صرف اسی لیے اُگل رہا ہے کہ اس سے تیار ہونے والا اطلس ہمارے جسموں پر سجے اور پھر آج کے سائنسی دَور میں کیمیاوی اشیاء نے ہم کو اس قدر نفیس اور عمدہ کپڑے مہیّا کر دیئے ہیں کہ انسان کے لباس میں ایک گونہ انقلاب آ گیا ہے - کیا خالق نے ہمارے لباس کے معاملہ میں ہماری خوراک کی طرح اپنی حد سے بڑھی ہوئی فیاضی کا مظاہرہ نہیں کیا ؟ اگر کیمیاوی کھاد کی مدد سے زمین ہمارے لیے پہلے سے کئی گنا زیادہ رزق اُگل رہی ہے تو کیمیاوی اشیاء کی بدولت ہمارے لباس اور پوشاک کے معاملہ میں کیا یہی کچھ نہیں ہو رہا ؟ الغرض خالق کے مہر و کرم نے دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کی خوراک اور لباس کا کیا خوب انتظام کیا ہے :-

آں کہ بدہد بے امیدے سُودہا
آں خدا است و خدا است و خدا

یعنی وہ ذات جو بغیر کسی ذاتی نفع کی امید کے دیتی ہے وہ خدا ہی ہے۔

اگر یہ سوال ہو کہ دُنیا کی آبادی کا کثیر حصّہ تو ابھی تک بھوک اور ننگ میں گرفتار ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ خالق کے مہر و کرم کی کوئی کمی ہرگز اس کا باعث نہیں بلکہ انسان کی اپنی ہی عمل و علم کی کمی اس کا سبب ہے۔ اگر پاکستان

یا کسی اور پسماندہ ملک کا ایک کسان اپنی زمین کے ایک ایکڑ سے وہ پیداوار حاصل نہیں کر رہا ، جو مثلاً جاپان کا کسان حاصل کر رہا ہے تو اس میں قصور کس کا ہے ؟ علمِ معاشیات کا ایک معمولی سا طالب علم آپ کو یہ حقیقت بآسانی ذہن نشین کرا دیگا کہ قوموں کی غربت اور افلاس اور ان کی ترقی اور خوشحالی میں خود انسانی سعی اور کوشش کا کس قدر اہم اور فیصلہ کُن حِصّہ ہے.
خالق نے ہر جگہ زمین کو کبھی نہ ختم ہونے والے خزانوں سے مالامال کر رکھا ہے اور جس نسبت سے ان خزانوں کو حاصل کرنے کی انسانی کوشش اور جد و جہد ہو گی اسی نسبت سے زمین اپنے خزانے انسان کے سپرد کرے گی اور سب سے بڑا خزانہ تو خود انسان کی اپنی ذات اور اس کی استعدادیں ہی ہیں اور حقیقت میں انہی کی ترقی اور نشو و نما میں قوموں کے عروج کا راز پوشیدہ ہے اور خالق نے اس بارہ میں حد سے زیادہ فیاضی برتی ہے اس لیے جو قوم بھی اپنی قوتوں کو بروئے کار لائے گی وہ اپنی کایا پلٹ لے گی۔ جاپان کی مثال سب کے سامنے ہے۔ مادّی ذرائع سے یہ ملک بہت تہی دست ہے ، لیکن اس وقت دنیا کے انتہائی ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑا ہے اور سو سال کے مختصر عرصہ میں وہاں کے لوگوں کا معیار زندگی جس بامِ رفعت پر پہنچا

ہے وہ باقی سب پسماندہ دنیا کے لیے ایک قابل تقلید نمونہ ہے۔

خوراک اور لباس کی بنیادی ضرورت کے علاوہ انسان کی رہائش کی ضرورت ہے اور اس سلسلہ میں خالق نے ہماری حاجت برآری کے لیے کیا کچھ پیدا نہیں کیا؟ مٹی، لکڑی، لوہا، پتھر. سنگ مرمر، شیشہ وغیرہ یہ سب اشیاء اسی غرض کے لیے ہیں کہ تا ہم کو مضبوط اور آرام دہ مکان میسّر آئیں اور ترقی یافتہ ملکوں نے خالق کی ان پیدا کردہ نعمتوں کو کام میں لا کر اپنی رہایش کی بستیوں کو جنّتِ ارضی کا نمونہ بنا لیا ہے۔ چنانچہ ان ممالک کی سیر و سیاحت کرنے والا ہر شخص یہ بات آسانی سے سمجھ لیتا ہے کہ یہ خوبصورت بستیاں، صاف ستھرے اور آرام دِہ مکان کبھی معرضِ وجود میں نہ آسکتے اگر ان کی تعمیر میں لگنے والی اشیاء خالق نے پیدا نہ کی ہوتیں۔

پھر انسانوں کو جو مختلف استعدادیں اور الگ الگ طاقتیں بخشی گئی ہیں اور ان میں جو تفاوت رکھا گیا ہے وہ بھی نوع انسانی پر خالق کا ایک عظیم احسان ہے۔ اگر سب انسان ایک سی ہی قوتوں کے مالک ہوتے تو دنیا کا کارخانہ کیسے چلتا؟

حق تعالیٰ کے مہر و کرم کا جو ذکر ہم نے اوپر کیا ہے اسے تھوڑے غور سے ہر انسان ہر وقت خود اپنی ذات اور تمام عالم میں ہر سُو پھیلا ہُوا دیکھ سکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ ظاہر میں آنکھ کو نظر آتا ہے اس کے پسِ پردہ جو کچھ چھُپا

ہوا اور پنہاں ہے وہ جستجو اور تحقیق پر انسان کو ورطۂ حیرت میں ڈالتا ہے۔ اگرچہ ہمارے اس مختصر مضمون میں کسی قسم کی سائنسی تفصیلات کی تو گنجائش نہیں، لیکن چند مختصر اشارات یہاں یہ ثابت کرنے کے لیے بے محل نہ ہوں گے کہ ہم جس شے کی بھی تہہ تک رسائی حاصل کریں وہاں ہی حق تعالےٰ کی بخشش بے پایاں ہمارے لیے کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے، ہماری زندگی کو کرۂ ارضی پر برقرار رکھنے کے لیے ہمارے مہربان خالق نے جو انتظامات کیے ہیں اُن کا تھوڑا سا حال سنو۔

ہماری زمین ایک گولے کی شکل میں خلا میں معلّق ہے اور اپنے محور کے گرد گردش کر رہی ہے اور غرض یہ ہے کہ ہمارے لیے دن اور رات پیدا ہوں تا ہم دن کو کام اور رات کو آرام کر سکیں، پھر اس گردش کے علاوہ یہ سورج کے گرد بھی گردش کر رہی ہے جو یہ سال بھر کی مدّت میں پوری کرتی ہے خلا میں یہ حرکات اس کو صحیح سمت میں قائم رکھتی ہیں پھر یہ خلا میں بالکل سیدھی قائم نہیں، بلکہ 23 درجہ کے قریب ایک طرف کو جھُکی ہوئی ہے اس کا یہ جھکاؤ ہمارے لیے مختلف موسموں کا باعث ہے پھر ایسی گیسیں جو ہماری زندگی کے لیے نہایت ضروری ہیں، پانچ صد میل کی بلندی تک اسے اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہیں اور

انہی گیسوں کا ایک بہت دبیز پردہ ہم کو اُن شہابوں کی تباہ کن
بارش سے بھی محفوظ رکھتا ہے جو روزانہ دو کروڑ کی تعداد میں
تیس میل فی سیکنڈ کی رفتار سے ہماری زمین کی فضا میں داخل
ہوتے ہیں ، دیگر فوائد کے علاوہ ہوا کا یہ خول ہمارے درجہ حرارت
کو بھی ان حدود و قیود میں رکھتا ہے جو ہمارے زندہ رہنے کے
لیے ازبس ضروری ہیں - ہماری زمین کا موجودہ حجم اگر کم و بیش
ہوتا تو ہماری زندگی محال ہو جاتی ، مثلاً اگر یہ چاند کے برابر
ہوتی تو اس کی کششِ ثقل موجودہ سے چھ حصے کم ہو جاتی اور
اس طرح ہوا اور پانی کا وجود ممکن نہ رہتا اور اگر اس کا حجم
موجودہ حجم سے دو چند ہوتا تو اس کی کششِ ثقل دوگنی ہو جاتی
جس کے نتیجہ میں ہمارا کرّۂ ہوائی اپنی موجودہ حالت میں قائم نہ
رہ سکتا اور ہماری زندگی ناممکن ہو جاتی اور اگر سورج سے اس
کا فاصلہ دُگنا ہوتا تو سورج سے حاصل ہونے والی حرارت صرف
ایک چوتھائی رہ جاتی اور زندگی محال ہو جاتی اور اسی طرح
اگر سورج سے اس کا موجودہ فاصلہ نصف ہوتا تو سورج کی
تمازت چار گنا ہو جاتی اور زندگی برقرار نہ رہتی - الغرض ہماری
زمین کی موجودہ جسامت ، اس کی موجودہ رفتارِ گردش ، اس کا
اپنے مدار میں جھکاؤ اور سورج سے اس کا موجودہ فاصلہ اور

پانچ صد میل تک اس کے گرد زندگی بخش گیسوں کا غلاف ہمارے مہربان خالق کے پیدا کردہ حکیمانہ اسبابِ رحمت ہیں جن کے طفیل ہم خاک نشینوں کی زندگی ممکن اور ہر قسم کی مسرتوں سے ہمکنار ہے۔ قرآن پاک میں حق تعالےٰ نے یہ جو فرمایا ہے وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا[1] پر غور کرو اور حظّ اُٹھاؤ کہ تمہارے مہربان خالق کی نعمتیں نہ صِرف گنی ہی نہیں جاسکتیں، بلکہ ان کا دامن چار دانگِ عالم میں ہر سُو اس طرح سے پھیلا ہوا ہے کہ کچھ بھی تو اس سے باہر نہیں۔

خالق کا مہر و کرم ہماری مادی اور جسمانی حاجات پورا کرنے پر ختم نہیں ہو جاتا :-

آنکہ برتن کرد ایں لطفِ اتم
کے کند محروم جاں را از کرم

یعنی جس نے ہمارے بدن پر کمال درجہ مہربانی کی ہے وہ ہماری جان کو کیوں اپنے کرم سے محروم کرے گا۔ حق تعالےٰ نے ہم کو عقل یعنی اپنی ذات کو پہچاننے کا جوہر عطا کر کے اور اپنی ذات کو ہمارا مقصود ٹھہرا کر ہمارے لیے لامتناہی ترقیات کے دروازے کھولے ہیں، لامتناہی ترقیات کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ انسان

---

[1] ابراہیم: آیت ۳۵ +

حق تعالیٰ کے حسن و جمال سے بہرہ ور ہونے کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور اس کی کوئی انتہا نہیں اس لیے انسان کی طلب جمال و وصال ہمیشہ ہی جاری رہے گی اگر حق تعالےٰ کے جمال کی کوئی انتہا ہوتی تو انسان بوجہ اپنی کمزور فطرت کے اس سے سیر ہو جاتا، کیونکہ جس شے سے انسان سیر ہو جائے وہ اپنی کشش کھو دیتی ہے، لیکن حق تعالےٰ کے جمال کی کہاں انتہا ممکن ہے کہ اس سے سیری کا سوال پیدا ہو؟ اور انسان کو خلود عطا کرنے کی بھی یہی حکمت ہے تا انسانی فطرت میں رکھی ہوئی خالق کے جمال کی طلب ہمیشہ ہی جاری رہے اور انسان کے دل میں جو ہمیشہ زندہ رہنے کی خواہش ہے اس کا بھی یہی راز ہے ہمارے دل میں ہمیشگی کی خواہش پیدا کر کے اس کی تشفی کا سامان نہ کرنا حق تعالیٰ کی کریمانہ شان کے خلاف تھا، اس لیے ہماری پیدائش کے بعد ہماری روح پر یعنی جو اصل انسان ہے اس نے فنا کو حرام ٹھہرا دیا ہے۔

جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

ہماری جسمانی موت ہرگز ہماری نیستی نہیں۔ اس کا مقصد تو ہم کو ایک وسیع تر عالم کی طرف لے جانا ہے جہاں خالق کے حسن سے

فیضیاب ہونے کے وہ مواقع ہیں جو اس محدود اور تنگ دنیا میں ممکن نہیں :-

کمالِ زندگی دیدار ذات است
طریقش رُستن از بندِ جہات است

یعنی زندگی کا کمال حق تعالےٰ کا دیدار ہے اور اس کا طریق یہ ہے کہ انسان کون و مکان کے علائق سے آزاد ہو جائے۔

ہماری موجودہ دنیا عالمِ آخرت کے مقابلہ میں رحمِ مادر کی طرح تنگ اور تاریک ہے۔ ہماری پیدائش سے قبل اگر رحمِ مادر میں ہم کو یہ کہا جاتا کہ یہاں کے مختصر قیام کے بعد ہم کو ایک وسیع تر عالم میں اس لیے لیجایا جائے گا کہ وہاں ہماری ترقی کا غیر محدود میدان ہے تو گو یہ بات (اگر ہمیں شعور بھی ہوتا) تو اس وقت ہرگز سمجھ نہ آتی، لیکن بایں ہمہ ہوتی حقیقت - موت اس لیے ہرگز ہماری فنا نہیں ، بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ہماری چند روزہ دنیا کی زندگی میں تو ہمارا مہربان خالق اپنی غیر محدود نعمتوں سے ہمیں مالا مال کرے اور حیرت انگیز رنگ میں. ہماری پرورش کرے ، لیکن پھر خود ہی ہمارا چراغِ ہستی بجھا کر ہم کو ابدی فنا کی آغوش میں دھکیل دے ۔ کیا ہماری تخلیق اور ہماری درجہ بدرجہ پرورش نیں اپنے بے پایاں کرم کا مظاہرہ کرنے والی ذات کے متعلق

ایسا گمان ممکن ہے ہرگز نہیں۔ ع

ہے موت میں ضرور کوئی راز دل نشیں   سب کچھ کے بعد کچھ بھی نہیں، یہ تو کچھ نہیں

اور پھر ایسا کرنا اس کی اپنی سنت اور حکمت کے بھی خلاف ہے کیا غور کرنے پر یہ صاف نظر نہیں آتا کہ ادنےٰ سے اعلیٰ کی طرف رجعت کا ایک حد درجہ حکیمانہ قانون خالق نے عالم میں جاری کر رکھا ہے ؎

جملہ اجزا در تحرّک در سکوں
ناطقاں اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

یعنی تمام اجزاء حرکت یا سکون کی حالت میں یہی پکارتے ہیں کہ ہم حق تعالےٰ کی طرف جا رہے ہیں۔

انسان اپنی ہستی کو دیکھے کہ کیا ایک وقت میں وہ خود ان عناصر کی منزل میں نہ تھا جن سے کہ وہ مرکّب ہے اور اگر ارتقاء کا حکیمانہ قانون کام نہ کر رہا ہوتا تو جو ترقی اس نے انسان بننے کی حالت تک کی ہے وہ کہاں ممکن تھی، حق تعالیٰ صرف خالق ہی نہیں بلکہ ربّ یعنی مبدّلِ ہستی بھی ہے اور اس کی ربوبیت کا تقاضہ ہے کہ زندگی بہتر سے بہتر صورت بدلتی رہے ابتدائے آفرینش سے اپنی موجودہ حالت تک انسان نے بے شمار صورتیں اختیار کی ہیں اور کیا ہر بعد میں آنے والی

حالت پہلی سے بہتر نہیں اور اگر یہ فنا اور بقا کا قانون جو ارتقاء کے قانون ہی کا عمل ہے جاری اور ساری نہ ہوتا تو لامتناہی ترقی بھلا کیسے ممکن تھی ؟ مثلاً ہم ذرا اس بات پر غور کریں کہ ہماری خوراک جو نباتات ، معدنیات وغیرہ پر مشتمل ہے ہمارے استعمال کے بعد یعنی اپنی اصل صورت کے فنا کے بعد ہمارے جسم کا حصّہ بن جاتی ہے اور ہماری زندگی کے قیام کا باعث بنتی ہے. اگر ہم نے خوراک استعمال نہ کی ہوتی تو ہمارا جسم کیونکر قائم رہتا اور ہماری عقل کا ظہور کیسے ہوتا ، ظاہر ہے کہ ہماری عقل کا ظہور صرف اسی صورت میں ممکن تھا کہ ہم زندہ ہوں جو بغیر خوراک ممکن نہیں ، اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ ہماری عقل ہماری خوراک کی ہی ایک ترقی یافتہ صورت ہے تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا اور پھر یہی انسانی عقل اپنی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی حیرت انگیز کارہائے نمایاں سرانجام دیتی ہے جس پر پوری تاریخِ عالم گواہ ہے ۔ الغرض جب عالم میں ہر شے ارتقاء کے حکیمانہ قانون کی تابع ہے تو ہم بھلا اس سے کیسے باہر ہو سکتے ہیں؟ اس لیے ارتقاء کا اٹل قانون یہ بات روز روشن کی طرح واضح کرتا ہے کہ ہماری جسمانی موت بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے کیا یہ بات سمجھنا کچھ مشکل ہے کہ دم بدم ترقی

اور تربیت پانے والی شے کی ہر نئی حالت اس کی پہلی حالت سے بہتر اور بلند ہوتی ہے اور یہ محض عدم سے ظہور میں آکر خالق کی صفتِ خالقیت اور ربوبیت کا روشن اور واضح ثبوت مہیّا کرتی ہے۔

ہے ایوولیوشن بس اِک تفسیرِ ربّ العالمین
کاش اس نقطے سے واقف ہوں مسلماں اِن دنوں

حیات بعد الممات کی اصل حقیقت تو اس زندگی میں ماورائے فہم ہے لیکن عالمِ خواب پر اگر ہم غور کریں تو عالمِ آخرت کے متعلق بعض باتیں ہم ضرور اخذ کر سکتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ خواب کے عالم میں جبکہ ہماری سب جسمانی حِسّیں بالکل بیکار اور معطّل پڑی ہوتی ہیں ہماری روح جسے ہم اصل انسان بھی کہہ سکتے ہیں اور جس پر موت کبھی بھی وارد نہ ہوگی ہمارے جسمانی اعضاء اور قویٰ کو کام میں لائے بغیر اپنے سب کام پوری طرح سرانجام دیتی ہے۔ دیکھنے کا فعل بغیر جسمانی آنکھوں کے، سُننے کا بغیر کانوں کے، چکھنے کا بغیر زبان کے، چلنے پھرنے کا بغیر پاؤں اور ٹانگوں کے۔ الغرض سب فعل بغیر اعضاء بالکل اسی طرح عمل میں آتے ہیں جس طرح کہ ہمارے جاگنے کی حالت میں یہ انجام پاتے ہیں اور ہم زمان و مکان کی قید سے مطلقاً آزاد ہو جاتے ہیں اور جو کچھ جاگتے ہوئے ہمارے لیے

ناممکن ہوتا ہے وہ خواب میں بہت سہل اور ممکن ہو جاتا ہے
مثلاً ہم ہوا میں خود کو اُڑتا دیکھتے ہیں سب قسم کے فاصلے اور
پیمانے ہمارے لیے بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں، کبھی ہم اپنے
آپ کو ایک مقام پر دیکھتے ہیں اور معاً بعد دوسری جگہ حالانکہ
دونوں جگہوں کے درمیان ہزارہا میل کی مسافت ہوتی ہے۔
اسی طرح ایسے لوگوں سے ہماری ملاقات ہوتی ہے جو عرصہ
دراز سے فوت شدہ ہیں، پھر خواب میں ہم جو کچھ دیکھ رہے ہوتے
ہیں اس وقت بالکل حقیقی معلوم دیتا ہے، حتیٰ کہ بعض ڈراؤنی
خوابوں کو دیکھ کر وحشت کے عالم میں ہم جاگ اُٹھتے ہیں اور یہ
معلوم کرکے یہ جاں گسل نظارہ تو ہم خواب میں دیکھ رہے تھے،
ہمارا کرب اور گھبراہٹ دور ہو جاتے ہیں۔جس پر ہم چین کا
سانس لیتے ہیں۔ اسی طرح ہم بعض وقت ایسی حسین خوابیں دیکھتے
ہیں کہ ان کا خوشکن اثر جاگنے کے بعد بھی عرصہ تک قائم رہتا
ہے۔پھر جاگ اُٹھنے کے بعد اپنی خوابوں کے نظارے جو ہم نے
جسمانی آنکھوں سے ہرگز نہ دیکھے تھے اور جن میں ہمارے دوسرے
اعضاء نے بھی کسی قسم کی شرکت نہ کی تھی(کیونکہ وہ تو سب
معطل پڑے تھے) ہم کو پوری طرح سے یاد بھی رہتے ہیں۔
اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ہماری جسمانی آنکھوں نے ایک

نظارہ دیکھا ہی نہیں تو وہ ہم نے کس طرح دیکھا ہے کیونکہ اس کا دیکھنا تو ہم کو خواب کے بعد بھی پوری طرح سے خوب یاد ہوتا ہے سو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ نظارہ ہماری روح نے دیکھا تھا اور حق تعالیٰ نے ہماری روح کا ہمارے جسم عنصری سے تعلق تو رکھا ہے لیکن اس کا اپنا وجود ہے اور یہ بغیر ہمارے جسمانی اعضاء کے زمان و مکان کی قید سے آزاد اپنی الگ دنیا رکھتا ہے اور یہ دنیا ہماری جسمانی موت کے بعد بھی جاری رہتی ہے اور عالمِ خواب روح کی ممکنات سے ہمیں بخوبی آگاہ کرتا ہے۔ عقل کے پجاری اور روح کے منکر ہمارے اس بیان کو شاید ایک ڈھکوسلہ خیال کریں، کیونکہ ان کے نزدیک جب روح جیسی غیر مادی شے کا وجود ہی ممکن نہیں، تو روح اور جسم کے تعلق کا بھلا کیا سوال ہو سکتا ہے، لیکن وہ عقل کے تو ضرور قائل ہیں اور کیا عقل ایک غیر مادی جوہر نہیں؟ اور اس کا انسانی دماغ سے تعلق تو اُن کے نزدیک بھی مسلّم ہے۔ حقیقت میں ان کے اس انکار کے اندر ہی ایک طرح کا اقرار پنہاں ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے ایک صاحبِ خانہ گھر کے اندر سے آواز دے کہ وہ گھر میں موجود نہیں۔ کاش وہ سمجھیں۔ اسی طرح یورپ کے ماہرینِ علم النفس بھی روح کی حقیقت کو تسلیم

نہیں کرتے لیکن تحلیلِ نفسی (PSYCHOANALYSIS) کے تجربات کی بنا پر جو حقائق وہ انسان کے لاشعور (SUB-CONSCIOUS) کے متعلق پیش کرتے ہیں ان پر اگر غور کیا جائے تو اُن کا پیش کردہ لاشعور اور روحِ انسانی ایک ہی شے کے دو مختلف ناموں والی بات بنتی ہے مثلاً فرائیڈ نے اپنے تجربات سے یہ ثابت کیا ہے کہ جب کسی شخص کو عملِ تنویم سے سُلا دیا جائے، تو عامل اس کی زندگی کے سب واقعات جن کو وہ ہوش کے عالم میں بالکل فراموش کر چکا ہوا ہوتا ہے تفصیل سے اخذ کر سکتا ہے کیونکہ اس کے لاشعور میں اس کے سب اعمال کی مکمل سرگزشت محفوظ پڑی ہوتی ہے اور دوسرے یہ کہ انسان کا لاشعور وقت اور فاصلہ کے قوانین سے بالکل آزاد ہے۔ اب اگر فرائیڈ کے تجربات اور نتائج کے مطابق انسان کا لاشعور یا دوسرے الفاظ میں انسان کی ایک ایسی ذہنی زندگی جو زمان اور مکان کی قید سے آزاد ہے، حقیقت میں موجود ہے تو پھر اس میں اور روحِ انسانی میں کیا فرق ہُوا؟ اور عالمِ خواب کی مثال سے اوپر ہم نے یہی ثابت کیا ہے کہ ہماری روح زمان و مکان کی قید سے آزاد اپنا الگ وجود رکھتی ہے جو بغیر رفاقت جسمانی اعضاء اپنا کام کرتی ہے اور موت پر اس کا وجود ہرگز فنا نہیں ہوتا بلکہ موت

صرف انسانی جسم سے اس کی علیحدگی کا نام ہے۔

الغرض موت، حشر ونشر، قیامت، جنّت، دوزخ سب ایسے امور ہیں کہ ان کے متعلق ہمیں کبھی بھی وہ علم حاصل نہیں ہو سکتا جو دنیا کی دوسری اشیاء کے متعلق حاصل اور ممکن ہے وجہ یہ کہ انسان کے علم کی سطح اس کی اپنی ارتقا کی سطح سے بلند نہیں ہو سکتی اس لیے اس دنیا میں ہم عالمِ آخرت کی اصل حقیقت کو سمجھنے سے کلی طور پر قاصر ہیں اس لیے اگر عالمِ آخرت کے متعلق ہم کو کچھ ذہن نشین کرانا مقصود ہو تو اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ ہم سے اس دنیا کی اشیاء کے حوالہ سے ہی عالمِ آخرت کا ذکر کیا جائے مثلاً اگر جنّت کی نعماء کی حقیقت کا بیان مطلوب ہے تو اس جہان کی لذّات کا بیان جن سے ہم بخوبی آشنا ہیں ہمارے لیے عالمِ آخرت کی نعماء کو قابلِ فہم بنا سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک اور احادیث میں یہی طریق اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی صورت ممکن ہی نہیں، لیکن بدقسمتی سے عوام النّاس بلکہ خواص تک نے عالمِ آخرت کا جو بیان قرآن پاک اور احادیث میں مذکور ہے اسے ظاہر پر محمول کر لیا ہے، حالانکہ تھوڑے سے تدبّر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اصل حقیقت ہرگز یہ نہیں بلکہ یہ

طریق تو محض انسان کو سمجھانے کی خاطر اختیار کیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے: مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ[۱]۔ یہ اس جنّت جس کا مومنوں کو وعدہ دیا گیا ہے کا تمثیلی بیان ہے یعنی حقیقی نہیں۔ پھر اسی طرح قرآن پاک میں حق تعالےٰ فرماتا ہے: فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ[۲]۔ یعنی کوئی نفس نیکی کرنے والا نہیں جانتا کہ کیا کیا نعمتیں ہیں جو اس کے لیے مخفی ہیں، یعنی دنیا کی نعمتوں میں ان نعمتوں کا نمونہ نہیں ورنہ وہ مخفی نہ کہلا سکتیں۔ دُودھ، انار، انگور، شہد وغیرہ کو ہم سب جانتے ہیں اور استعمال کرتے ہیں اس لیے یہ ہمارے لیے مخفی نہیں۔ پھر رسول پاکؐ جنّت کے متعلق فرماتے ہیں کہ لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ۔ یعنی اس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے نہ کسی کان نے سُنا ہے اور نہ کسی بشر کے دل میں اس کا تصوّر ہی آیا ہے۔ اب جبکہ خود حق تعالےٰ اور رسول پاکؐ جنت کی نعماء کو بالکل نئی اور نرالی بتائیں لیکن ہم ان کو اس دنیا کی ہی نعمتیں خیال کریں تو کیا ایسا کرنے سے ہم قرآن پاک اور حدیث سے دُور نہیں جا پڑتے؟ قیامت، حشر نشر، میزان، جنّت، دوزخ سب برحق ہیں، لیکن ان کا جسمانی طور سے نقشہ کھینچنا کسی طرح سے درست نہیں

---

[۱] محمّد: آیت ۱۶ + [۲] السجدۃ: آیت ۱۸ +

ہوسکتا، کیونکہ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ قیامت کے دن حق تعالیٰ کسی لق و دق میدان میں دنیا کے بادشاہوں کی طرح تخت پر متمکّن ہوگا اور مُردے قبروں سے نکل نکل کر حساب کتاب کے لیے اس کے حضور حاضر ہونگے اور پھر بعد از حساب جنّت دوزخ میں داخل ہوتے جائیں گے۔ ایسا تو نعوذ باللہ حق تعالےٰ کو جسمانی تصوّر کرکے ہی سوچا جا سکتا ہے جس سے وہ پاک ہے، قرآن پاک میں عالمِ آخرت کے متعلق مندرج سب کچھ برحق ہے، لیکن سب ایسے طور سے ہوگا جو حق تعالیٰ کی پاکیزگی، تقدّس، تنزّہ اور صفاتِ کاملہ کے عین موافق اور مطابق ہوگا نہ کہ اس کے خلاف۔ موت کے وقت ہماری روح ہمارے مادی جسم سے الگ ہو جاتی ہے۔ ہمارا جسمِ مادّی ہماری روح کے لیے بطور ایک قالب یا آلہ کے ہے۔ لیکن روح اور جسم کے اس فراق پر موت صرف ہمارے جسم پر وارد ہوتی ہے نہ کہ روح پر اور یہ اس لیے کہ جس ارفع و اعلیٰ عالم کی طرف ہمارا خالق ہم کو لیجانا چاہتا ہے اس کے لیے ہمارا مادّی جسم بوجہ اپنی کثافت کے ناکارہ ہے، چونکہ ہماری روح کا مجرد وجود بغیر جسم نہ اس دنیا میں نہ ہی عالمِ آخرت میں ممکن ہے اس لیے ہمارے جسم کی موت پر حق تعالےٰ ہماری روح کو ایک دوسرا نیا قالب یا نیا جسم عطا

فرمائے گا اور ہمارے اس دنیا کے اعمال اس نئے جسم کے لیے بطور خمیر ہوں گے۔ یعنی اگر صالح تھے تو ہمارا نیا جسم نوری ہوگا اور حق تعالیٰ چونکہ سراسر نور ہی نور ہے اس لیے نوری جسم پانے والے حق تعالےٰ کے قرب اور دیدار سے مشرف ہوں گے اور جنت میں ہوں گے، لیکن گناہ کی زندگی بسر کرنے والوں کو ان کے اعمال کے نتیجہ میں تاریک اور سیاہ جسم ملے گا اور تاریکی اور سیاہی کا چونکہ نور سے بُعد ہے اس لیے سیاہ جسم پانے والے حق تعالیٰ کے دیدار اور اس کے قرب سے محروم ہوں گے اور دوزخ میں ہوں گے۔ قرآن پاک میں حق تعالیٰ جنتیوں کے متعلق فرماتا ہے:- يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ۔[1] یعنی اس روز تو دیکھے گا کہ مومنوں کا یہ نور جو دنیا میں پوشیدہ طور پر ہے ظاہر ظاہر اُن کے آگے اور ان کے داہنی جانب دوڑتا ہوگا اور پھر دوسری جگہ فرماتا ہے: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔[2] یعنی جو لوگ دنیا میں ایمانِ نور رکھتے ہیں ان کا نور قیامت کو ان کے آگے اور ان کے داہنی طرف دوڑتا ہوگا وہ ہمیشہ یہی کہتے رہیں گے کہ اے خدا

---

[1] الحدید آیت ۱۳ + [2] التحریم آیت ۹ +

ہمارے نور کو کمال تک پہنچا اور اپنی مغفرت کے اندر ہمیں لے لے، تو ہر چیز پر قادر ہے۔

جنتیوں کا جنت میں اپنے نور کے کمال کے لیے ہر وقت حق تعالیٰ سے دعا کرتے رہنا صاف تبلاتا ہے کہ جنّت کی ترقیات لامتناہی ہیں، جب ان کو نور کے کمال کی ایک حالت میسّر آجائے گی تو دوسری حالت کا کمال ان پر ظاہر ہوگا اور اپنی پہلی حالت کو ناقص پاکر دوسری کے کمال کے لیے التجا کریں گے، اور پھر جب یہ حاصل ہو جائے گی تو تیسری کا کمال طلب کریں گے، کیونکہ دوسری حالت اب اُن کو ناقص نظر آرہی ہو گی اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا چلا جائے گا، کبھی ختم نہ ہو گا:-

ہر لحظہ نیا طُور نئی برقِ تجلّی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

حق تعالیٰ کے حسن و جمال کی بھلا کب انتہا ہے کہ وہ پہنچ جائے اور انسان اس سے سیر ہو جائے۔

دوزخیوں کے متعلّق حق تعالیٰ فرماتا ہے: مَنْ کَانَ فِیْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰی فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی وَ اَضَلُّ سَبِیْلًا۔[1] یعنی جو اس دنیا میں اندھا رہا وہ آخرت میں بھی اندھا ہی ہو گا بلکہ اندھوں سے بدتر۔

---

[1] بنی اسرائیل: آیت ۷۳ ÷

اس آیت کا تو مطلب یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ جو شخص اس دنیا میں اندھا ہوگا وہ عالمِ آخرت میں بھی اندھا اُٹھیگا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہاں کی پاک زندگی اور اعمالِ صالح انسان کو عالمِ آخرت میں حق تعالیٰ کے دیدار کے لیے بینائی اور بصارت بخشتے ہیں اسی طرح گناہوں سے آلودہ زندگی روحانی نابینائی یعنی حق تعالیٰ کے دیدار سے محرومی اور دوری کا باعث بنتی ہے۔ جزا و سزا باہر سے وارد نہیں ہوتی، بلکہ انسان کی فطرت کے قوانین سے خود بخود پیدا ہوتی ہے اور انسان کی اس دنیا کی عملی حالتیں ٹھوس حقیقتیں بن کر اس کے سامنے آتی ہیں۔ سزا میں خدا تعالےٰ ہرگز بندہ پر کسی قسم کی مصیبت نہیں ڈالتا بلکہ اس کے اپنے ہی بُرے اعمال اس کے آگے رکھ دیتا ہے اور جزا میں اس کے نیک اعمال کا بدلہ جنت اور جنت کی نعماء کے رنگ میں اسے عطا کرتا ہے اور رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ کے ماتحت دوزخ بھی حقیقت میں اس کی رحمت کا ہی مظاہرہ ہے۔ کیا بیمار خود ہسپتال میں داخل ہو کر اپنے علاج کا سامان نہیں ڈھونڈتا اور ہر قسم کی تکالیف جھیلنے کے علاوہ زرِ کثیر اپنی گرہ سے خرچ نہیں کرتا اور ضرورت پڑے تو عملِ جراحی تک کے لیے اپنے جسم کو پیش نہیں کر دیتا اور یہ سب کیوں؟ صرف اس لیے کہ اسے شفا

حاصل ہو۔ عالمِ آخرت میں ہمارا مہربان خالق یہی اہتمام ان لوگوں
کے لیے کریگا جو اس کے علم میں اپنی دنیوی زندگی کے گناہوں
کی وجہ سے روحانی طور سے بیمار ہونگے تا وہ رکاوٹیں دور ہو جائیں۔
جوانہوں نے خود ہی اس کمال کے راستہ میں کھڑی کی تھیں جس
کو حاصل کرنے کے لیے وہ پیدا کیے گئے تھے اور وہ اپنی
پیدائش کی اصل غرض کو پا سکیں، دوزخ کا مقصد انتقام نہیں
بلکہ اصلاح اور تربیت ہے، مخالفینِ مذہب نے یہ غلط سمجھ
لیا ہے کہ جزا اور سزا سے خدا تعالیٰ اپنی خوشنودی یا ناراضگی
کا اظہار کرتا ہے جسے چاہتا ہے خوش ہو کر جنّت میں، جسے
چاہتا ہے ناراض ہو کر دوزخ میں داخل کر دیتا ہے۔ قرآن
پاک میں دوزخ کو گناہگاروں کی ماں کہا گیا ہے جیسے فرمایا
اُمُّہٗ ھَاوِیَہ (قارعۃ) اور ماں کے پیٹ میں بچّہ صرف اُسی وقت
تک ہی رہتا ہے جب تک کہ اس کی نشو و نما اس حالت کو
نہیں پہنچ جاتی جو دنیا کی زندگی شروع کرنے کے لیے ضروری
ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بچے سے ماں کا سلوک کامل ہمدردی اور خیر خواہی
کا ہوتا ہے اس لیے جہاں محبّت ہو گی وہاں سزا صرف اصلاح
کے لیے ہو گی۔ جہنم کا مقصد چونکہ تہذیب اور اصلاح ہے نہ کہ انتقام
اس لیے دوزخ ابدی نہیں ہو سکتی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن پاک

ہیں دوزخیوں کے متعلق خَالِدِیْنَ فِیْهَا اَبَدًا [1] کئی مقامات پر آیا ہے۔ لیکن اس سے مراد محض لمبا زمانہ ہے۔ سورۃ ہود میں اللہ تعالےٰ جنتیوں اور دوزخیوں کے متعلق فرماتا ہے: فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ لَهُمْ فِیْهَا زَفِیْرٌ وَّ شَهِیْقٌ ۝ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ۝ وَ اَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ ۝ [2] یعنی جو بد بخت ثابت ہوں گے وہ آگ میں داخل ہوں گے، اس میں کسی وقت ان کے درد سے لمبے سانس نکل رہے ہوں گے اور کسی وقت ہچکی کی حالت کے مشابہ سانس نکل رہے ہونگے۔ وہ اس میں اس وقت تک رہتے چلے جائیں گے جب تک کہ آسمان اور زمین قائم ہیں، سوائے اس عرصہ کے جو تیرا رب چاہے۔ تیرا رب جو چاہتا ہے، اسے کر کے رہتا ہے اور جو خوش نصیب ثابت ہوں گے وہ جنت میں ہوں گے وہ اس میں اس وقت تک رہتے چلے جائیں گے کہ جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں سوائے اس وقت کے جو تیرا رب چاہے یہ ایسی عطا ہے جو کبھی کاٹی نہیں جائے گی۔

اب اگر دوزخ ابدی ہے تو جیسے جنت کے متعلق حق تعالےٰ

---

[1] نساء: ۵۸ ۔ [2] ہود آیت ۱۰۷ تا ۱۰۹

نے صاف فرما دیا ہے یہ ایسی جزا ہے جو کبھی منقطع نہ ہوگی، دوزخ کے متعلق حق تعالےٰ نے کیوں ایسی صراحت نہ فرمائی؟ دوزخ اور جنت کا اکٹھا ذکر اور ایک کے ابدی ہونے کا واضح اعلان اور ایک کے متعلق اس بارہ میں مکمل خاموشی صاف ظاہر کرتی ہے کہ دوزخ عارضی اور وقتی ہے اور پھر کیا رسول پاکؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ یَاْتِیْ عَلٰی جَھَنَّمَ زَمَانٌ لَیْسَ فِیْھَا اَحَدٌ[1] - یعنی جہنم پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ جب اس میں کوئی شخص نہیں ہوگا۔

شاید یہ کہا جائے کہ ہم نے تصویر کا ایک ہی رُخ پیش کیا ہے - کیا دنیا میں رنج وغم، ہلاکت و بربادی انسان کی قسمت میں نہیں ہے؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ خالق کی طرف سے آنے والی ہر مصیبت اپنے اندر رحمت کے بے شمار خزائن پنہاں رکھتی ہے اگرچہ یہ الگ بات ہے کہ اس کی حکمت فوراً انسان پر عیاں نہ ہو سکے اکبر مرحوم نے بہت خوب کہا ہے:-

غم میں بھی قانونِ فطرت سے ہیں کچھ بدظن نہیں
یہ سمجھتا ہوں کہ میرا دوست ہے دشمن نہیں

سب سے بڑی مصیبت جس کا انسان دنیا میں تصور کر سکتا ہے وہ اس کی اپنی موت یا ہلاکت ہی ہو سکتی ہے لیکن جیسے

---

[1] تفسیر معالم التنزیل زیر آیت فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا۔

کہ ہم پہلے واضح کر آئے ہیں موت درحقیقت انسان کی اپنی ہی ترقی کی ایک منزل یا زینہ ہے، اس کے علاوہ خود نسلِ انسانی کی مسلسل ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایک نسل کی جگہ دوسری لیتی رہے تاکہ ترقی کا عمل پیہم جاری رہے، پھر بالفرض اگر کسی طریق سے موت کو دنیا سے خارج کیا جا سکے تو کیا اس بات کے سمجھنے میں کچھ بھی مشکل ہو سکتی ہے کہ ہمارا کرہ ارضی باوجود اپنی وسعت کے اس قدر تنگ ہو جائے گا کہ اس میں تل رکھنے کی جگہ باقی نہ رہے گی۔ اس صورت میں موت پر سب سے زیادہ اعتراض کرنے والے خود ہی سب سے پہلے اسے نسلِ انسانی کے لیے ضروری قرار دیں گے کیوں کہ انسانوں کے اژدہام کے باعث دنیا جہنم کا عملی نمونہ ہو جائے گی۔ اقتصادیادت اور عمرانیات کے ماہرین آئے دن اسی وجہ سے دنیا کی سرعت سے بڑھتی ہوئی آبادی کو ایک ایسی حدِ اعتدال پر رکھنے کے حق میں آوازیں بلند کرتے رہتے ہیں جس میں شرح پیدائش اور اموات برابر ہو۔

پھر خالق کے سب کاموں کی حکمت کا انسان کو سمجھ نہ آ سکنا یا فوری طور سے قابلِ فہم نہ ہونا ہرگز اس بات کی دلیل نہیں کہ یہ بلا حکمت ہیں کیوں کہ عدمِ علم سے عدمِ

حکمت ثابت نہیں۔ مثال کے طور پر انسان کو آج تک یورینائٹ (یورینیم کی کچی دھات) میں سوائے ایک پتھر کے اور کچھ نظر نہ آیا لیکن اب اپنی علمی ترقی کے باعث آج اس نے اس میں جوہری توانائی کا ایک ایسا عظیم خزانہ دریافت کر لیا ہے کہ ہمارا موجودہ دور محض اسی وجہ سے جوہری دور کہلاتا ہے۔
پہلی بات جو یاد رکھنی چاہیئے وہ یہ ہے کہ مشکلات اور مصیبتیں انسان کی صلاحیتوں کو اُجاگر کرتی ہیں ساری ترقی مشکلات اور ناموافق حالات پر عبور حاصل کرنے کا ہی نام ہے:-

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اُڑانے کے لیے

دوسری بات یہ ہے کہ اگر رنج و غم نہ ہوتا تو راحت اور خوشی بھی ممکن نہ تھی:-

رنج و غم را حق پئے آں آفرید
تا بدیں ضد خوش دلی آید پدید

یعنی رنج و غم کو حق تعالےٰ نے اس لیے پیدا کیا ہے تا اس ضد سے راحت اور خوشی کا احساس ہو۔ تیسری بات یہ ہے کہ رنج و غم کے ذریعہ انسان کا امتحان مقصود ہے اور امتحان کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ حق تعالےٰ کو انسان کی اندرونی

حالت کا علم نہیں ہوتا، بلکہ اس امتحان کے ذریعہ خود اس کی ہی حالت کو اس پر ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے تا اسے معلوم ہوجائے کہ وہ کس مقام پر کھڑا ہے۔

آں خدا را میرسد کو امتحاں   پیش آرد ہر دمے با بندگاں
تا بما مارا نماید آشکار   کہ چہ داریم از عقیدہ در سرار

یعنی اس خداوند تعالیٰ کو یہ حق ہے کہ بندوں کا ہر وقت امتحان کرے تاکہ ہماری حالت اعلانیہ دکھادے کہ ہم اپنے دل میں کیا عقیدہ رکھتے ہیں۔ پھر صبر کی صلاحیت بغیر مشکلات اور تکالیف کیونکر پیدا ہو سکتی ہے، کیا سونا کٹھالی میں پڑے بغیر کندن بن سکتا ہے؛ پھر دنیا میں شر کے وجود کو بعض نادان حق تعالےٰ کے رحم کے خلاف بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مطلق شر کا دنیا میں کوئی وجود نہیں مثلاً آگ کو ہی لیجیے۔ یہی آگ جنگ کے دوران انسانوں کی ہلاکت اور تباہی کا باعث بنتی ہے، لیکن حقیقت میں یہ شرِ مطلق ہرگز نہیں کیونکہ خالق نے تو اسے بطور خیر ہی پیدا کیا ہے۔ اگر آگ نہ ہوتی تو انسانی تہذیب و تمدّن، صنعت و حرفت کا کہاں وجود ہوتا۔ اگر آگ تباہی اور بربادی کا باعث بنتی ہے تو یہ اس کا غلط استعمال ہے، جو خالق کے منشا کے خلاف ہے۔ کیونکہ اس نے انسان کو جنگ و جدل اور قتل و غارت سے سختی

سے روکا ہے اور اگر کوئی کہے کہ ایسی آگ کیوں نہ بنائی گئی کہ جس میں شر کا پہلو نہ ہوتا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسی کوئی آگ نہیں ہو سکتی جو جلانے کے ساتھ ٹھنڈا بھی کرے یعنی آگ بھی، ہو اور پانی بھی - یعنی ایک ہی وقت میں ایک شے زہر بھی ہو اور تریاق بھی اور اگر ایسا ہو تو یہ ضدّین کو جمع کرنے والی بات ہے جو ناممکن ہے - الغرض شر مطلق کا کوئی وجود نہیں، کیونکہ ہر شے کے اندر خالق نے خیر رکھی ہے اور یہ ہمارا غلط استعمال جو اسے شر بنا دیتا ہے -

ہماری دنیا کی تخلیق خالق نے جس رنگ میں کی ہے وہ حد درجہ حکیمانہ ہے کیونکہ ہماری استعدادوں کو چیلنج کر کے ان کا نشوونما خالق کے مدّ نظر تھا، اس لیے ہماری یہ دنیا جنّت نہیں ہو سکتی تھی، جہاں راحت اور سکھ کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا لیکن ظاہر ہے کہ اخلاقی اقدار صرف ایسی ہی دنیا میں، ممکن ہیں جہاں نیکی اور بدی کے مواقع ہوں کیونکہ اگر کسی سے بھلائی کرنا نیکی ہے اور کسی سے بُرائی کرنا بدی ہے تو یہ جنت میں تو ممکن نہیں، کیونکہ وہاں نہ تو کسی کے ساتھ نیکی کی گنجائش ہو گی اور نہ بُرائی کرنے کی اور جہاں نیکی اور بدی دونوں خارج از امکان ہوں وہاں کسی قسم کی اخلاقی اقدار کا اظہار کیسے ہو سکتا ہے؟

بہشت آں جا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

یعنی بہشت وہ جگہ ہے جہاں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں اور کسی کو کسی سے کوئی دُکھ پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اخلاقی اقدار کے بننے اور سنورنے کے لیے اور اُن کے اظہار کے لیے ہماری جیسی دُنیا کا ہونا ازبس ضروری تھا اور اس وجہ سے بدی اور شر کا خیر کے ساتھ ہونا ناگزیر ٹھہرا۔ کمیِ تدبّر کی وجہ سے اگر کوئی اس بات کو نہ سمجھ سکے تو اس کا کیا علاج ہے چونکہ اس دنیا میں ہماری اخلاقی استعدادوں کا نشو و نما مطلوب ہے بعینہٖ جیسے ایک سکول یا جمنیزیم (GYM NASIUM) میں طالبعلم کا ذہنی اور جسمانی نشو و نما مطلوب ہوتا ہے اس لیے اسے عارضی اور فانی بنایا گیا ہے کیونکہ سکول میں بھی تو طالب علم زندگی کا ایک بہت ہی مختصر حِصّہ گذارتا ہے، دنیا کی بے ثباتی اور ناپائداری پر کفِ افسوس ملنے والوں کو کیا یہ نظر نہیں آتا کہ اسے عارضی اور فانی رکھنے میں خالق نے اپنے بندوں پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ رنج و غم انسان کی سیرت سازی میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

دیدۂ بینا میں داغِ غم چراغِ سینہ ہے — رُوح کو سامانِ زینت آہ کا آئینہ ہے
حادثاتِ غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال — غازہ ہے آئینۂ دل کے لیے گردِ ملال
طائرِ دل کے لیے غم شہپرِ پرواز ہے — راز ہے انساں کا دل غم انکشافِ راز ہے
غم نہیں غم رُوح کا اِک نغمۂ خاموش ہے — جو سرودِ بربطِ ہستی سے ہم آغوش ہے
شام جس کی آشنائے نالۂ "یارب" نہیں — جلوہ پیرا جس کی شب میں اشک کے کوکب نہیں
جس کا جامِ دل شکستِ غم سے ہے نا آشنا — جو سدا مستِ شرابِ عیش و عشرت ہی رہا
ہاتھ جس گلچیں کا ہے محفوظ نوکِ خار سے — عشق جس کا بے خبر ہے ہجر کے آزار سے
کلفتِ غم گرچہ اس کے روز و شب سے دُور ہے — زندگی کا راز اس کی آنکھ سے مستُور ہے

مثنوی مولانا روم میں بھی یہی مضمون بہت عمدگی کے ساتھ یوں بیان کیا گیا ہے :-

بندہ می نالد بحق از دردِ خویش — صد شکایت می کند از رنجِ نیش
حق ہمی گوید کہ آخر رنج و درد — مر ترا لابہ کناں و راست کرد
ایں گلہ زاں نعمتے کن کت زند
از درِ ما دور و مطرودت کند
در حقیقت ہر عدو داروئے تست — کیمیائے نافع و دلجوئے تست
کہ ازو اندر گریزی در خلا — استعانت جوئی از فضلِ خدا
در حقیقت دوستانت دشمنند
کہ ز حضرت دُور و مشغولت کنند

یعنی بندہ حق تعالےٰ کی درگاہ میں اپنے درد کی فریاد کرتا ہے اور زخم کے دُکھ کی سینکڑوں شکایات کرتا ہے اور حق تعالےٰ فرماتا ہے کہ آخر اس درد و رنج نے تجھ کو تضرّع کرنے والا راست رو بنا دیا اس لیے اس کو اچھا سمجھنا چاہیئے۔ یہ شکایت اس نعمت سے کرو جو تجھ کو ہماری بارگاہ سے دُور لے جائے اور تجھے مردُود کردے، درحقیقت ہر دشمن تمہارے اخلاقی اور روحانی امراض کے علاج کے لیے دوا ہے بلکہ وہ تمہارے لیے مفید کیمیا اور تمہاری دلجوئی کرنے والا ہے، کیونکہ تُو اس کی وجہ سے خلوت میں جاتا ہے اور خدا کے فضل سے مدد مانگتا ہے۔ بس دشمن تمہارا رجوع بحق ہونے کا محرک ہُوا اس لیے وہ تمہارے لیے مفید ہے۔
درحقیقت تیرے دوست دشمن ہیں جو بارگاہِ حق سے تجھے دُور اور غیر متوجہ کر دیتے ہیں۔ پھر دنیا میں بہت سا رنج و غم بعض انسان اپنے ہاتھوں سے دوسروں کے لیے پیدا کرتے ہیں۔ ہٹلر کی تازہ مثال سب کے سامنے ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ کیوں انسان کو ایسی طاقت دی گئی جس کے غلط استعمال سے وہ سب دنیا کو عذابِ الیم میں مبتلا کر دیتا ہے تو اس اعتراض کا مطلب یہ ہوگا کہ کیوں انسان کو با اختیار بنایا گیا ہے یعنی کیوں اسے نیکی کرنے کی طاقت دی گئی ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ نیکی کرنے کی

طاقت کے ساتھ یہ لازم ہے کہ اُسے بدی کرنے کا بھی پورا اختیار ہو اگر اسے نیکی اور بدی کا اختیار نہ دیا جاتا تو پھر وہ انسان نہ ہوتا بلکہ فرشتہ ہوتا کیونکہ فرشتوں کو کوئی اختیار نہیں، اُنہیں جس امر پر متقرر اور مامور کر دیا جائے وہ اس کے خلاف نہیں کر سکتے لیکن انسان نے چونکہ ترقی کرنا تھی یعنی آگے کی طرف بڑھنا تھا، اس لیے اس کے قدموں میں حرکت کرنے کی طاقت کا ہونا ازبس ضروری تھا اور حرکت کی طاقت کے موجود ہونے کا مطلب ہی یہی ہے کہ انسان جس سمت بھی چاہے حرکت کر سکے۔ خواہ آگے، خواہ پیچھے۔ اب اگر کوئی انسان آگے جانے کی بجائے پیچھے کی طرف دوڑ پڑے تو اس میں قصور کس کا ہے؟ آیت لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ أَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝[۱] میں اسی حقیقت کا بیان ہے، چنانچہ فرمایا: ہم نے انسان کو موزوں سے موزوں حالت میں پیدا کیا ہے پھر ہم نے اس کو (اس کے بداعمال کی وجہ سے) ادنیٰ درجوں سے بھی بدتر درجہ کی طرف لوٹا دیا۔

تیسرا سبب محبت کا کمال ہے یہ انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ کمال سے محبت کرتا ہے اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ

"کسبِ کمال کن کہ عزیزِ جہاں شوی"

---

[۱] سورۃ التین آیت ۵-۶

یعنی وہ کام کرو جس سے کمال کا اظہار ہوتا ہو، تا لوگ تم سے محبّت
کریں۔ حاتم طائی اور نوشیرواں عادل کا کیوں لوگ آج بھی عزّت
سے نام لیتے ہیں؟ وہ صرف اس وجہ سے کہ ایک میں سخاوت
اور دوسرے میں عدل درجۂ کمال پر تھا اسی طرح اور بھی جن
جن لوگوں نے کسی بھی خوبی میں کمال حاصل کیا لوگ ان کو محبّت
اور احترام سے یاد کرتے ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ صاحب کمال
کی صفتِ کمال سے ہم خود فیضیاب ہوں، محض کمال کا کسی
میں موجود ہونا ہی ہمارے دل میں اس کے لیے محبّت اور تحسین
کے جذبات پیدا کر دیتا ہے اور اگر یہ بات نہ ہوتی تو سینکڑوں
اور ہزاروں سال پہلے کے صاحبِ کمال لوگوں کے لیے آج ہمارے
دل میں کیوں قدر اور محبّت ہوتی؟ الغرض انسان مجبور ہے کہ
کمال سے محبت کرے اور ذی کمال کی محبت میں گرویدہ ہو جائے
اب اگر ہم غور کریں تو صاف نظر آتا ہے کہ حقیقی کمال صرف
اور صرف حق تعالیٰ کی ذات میں پایا جاتا ہے۔ اس کی جس بھی
صفت میں ہم غور کریں وہاں ہی اس کا کمال ہمیں حیرت میں ڈالتا
ہے کیا اس کی خالقیت، ربوبیت، رحمانیت، مالکیت یا اس کی
قدرت یا اس کا علم ہم کو حیران و ششدر نہیں کرتے؟ ذرا سوچو
تو سہی کہ اس نے کائنات کی تخلیق میں کس کمال کا مظاہرہ کیا

ہے یعنی کس طرح اپنی قدرت کاملہ سے نیست سے ہست کیا ہے

کردی دو جہاں عیاں ز قدرت

بے مادّہ و بے نیازِ انصار

یعنی تو نے محض قدرت سے دونوں جہان پیدا کر دیئے بغیر مادّہ کے اور بغیر مددگاروں کے اور پھر نہایت درجہ حکیمانہ قوانین میں ہر شے کو جکڑ دیا۔

ماہ را نیست طاقتِ ایں کار

کہ بتابد بروز چوں احرار

نیز خورشید را نہ یارائے

کہ نہد بر سریرِ شب پائے

یعنی چاند کو اس امر کی قدرت حاصل نہیں کہ وہ دن کو آزادی سے چمک سکے اور اسی طرح سورج کو بھی یہ قوت نہیں کہ وہ رات کے تخت پر قدم رکھ سکے۔

خلا کی حیرتناک وسعتوں میں اتنے بڑے اور اتنے عظیم الشان اجرامِ سماویہ کہ جن کی تعداد اور آپس کے فاصلے انسانی دماغ کو ماؤف کرتے ہیں، کس طرح بغیر ستونوں کے معلّق کر دیئے ہیں اور یہ سب اپنے اپنے مقررہ راستوں پر نا معلوم کب سے اسی طرح گامزن ہیں۔ تفصیل کے لیے

فلکیات کی کوئی کتاب اُٹھائیے اور اسے کھول کر دیکھئے کہ خلا کو
خالق نے کن کمالات سے بھر دیا ہے اور پھر آسمانوں سے نگاہ ہٹا کر
اگر ہم اپنی زمین کو دیکھیں۔ اگرچہ تمام کائنات میں ہماری زمین کا مقام
ایک ذرۂ خاکی سے زیادہ نہیں تو یہاں بھی آنکھ جس رنگ سے کمالات
سے دوچار ہوتی ہے وہ حد درجہ وجد آفریں ہے اور اصل حقیقت
یہ ہے کہ زمین پر موجود ہر شے بشمول انسان صانع عالم کے کمالات
کا ایک حیران کن مرقع ہے۔ ہم کسی بھی علم کا مطالعہ کریں اور کسی
طرف بھی نگاہ دوڑائیں خالق کی بے مثل صنعت گری اور حکیمانہ کارکردگی
ہر سمت جلوہ گر ہے اور اس کا دامن اس قدر وسیع اور ہمہ گیر ہے
کہ ہر ادنیٰ سے اعلیٰ اور ہر چھوٹی سے بڑی شے اس کی لپیٹ میں
ہے القصّہ خواہ ہم ایک بڑے سے بڑے ستارے کو دیکھیں یا پرِ پشہ
جیسی حقیر شے کو دونوں کی حقیقت جب ہم پر کھُلتی ہے تو ہم حیرت
کے عالم میں ڈوب جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ہماری زمین، سمندر، پہاڑ
شجر، حجر، معدنیات، نباتات، ہم خود اور خلائے آسمانی میں موجود سب
کچھ صانعِ عالم کے کمالات کی ایک بولتی ہوئی تصویر ہے:۔

ہر ذرّہ فشاند از تو نُورے ہر قطرہ براند از تو انہار
ہر شُو ز عجائبِ تو شورے ہر جا ز غرائبِ تو اذکار

یعنی ہر ذرہ تیرا نُور پھیلاتا ہے ہر قطرہ تیری توصیف کی نہریں

بہاتا ہے تیرے عجائب کا ہر طرف شور ہے اور تیرے غرائب کا ہر جگہ ذکر ہے۔

سائنس داں کہتے ہیں کہ خاک کے ایک ذرّہ کے اجزا کی تعداد کائنات میں موجود سب اجرامِ فلکی کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے اور پھر یہ سب اجزا حیرت انگیز قوانین کے ماتحت آپس میں اس رنگ میں منسلک ہیں کہ انسان کو ان کے متعلق ہنوز بہت ہی تھوڑا علم حاصل ہو سکا ہے، لیکن جو ہُوا ہے اس سے یہ صاف عیاں ہوتا ہے کہ موجودہ علومِ ریاضی اور الجبرا ان قوانین کا احاطہ کرنے کے لیے یکسر ناکافی ہیں۔

نہیں دیکھا ابھی تم نے مرے محبوب کا چہرہ جو دیکھو گے تمہارے علم کی پردہ دری ہوگی

تفصیلات سے قطع نظر مثلاً انسان صرف اسی ایک بات پر غور کرے کہ خالق نے جب سے انسانوں کو پیدا کرنا شروع کیا ہے آج تک کتنے انسان پیدا ہو چکے ہونگے:-

از عدم تا سوئے ہستی ہر زماں ہست یارب کارواں در کارواں

یعنی ہر زمانہ میں انسان کس قدر عدم سے وجود میں آ رہے ہیں، اس کا شمار نہیں، گروہ در گروہ اس دنیا میں آتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن یہ کس قدر حیرت انگیز بات ہے کہ ہر انسان دوسرے انسان سے مختلف ہے اور پھر اس کمال کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ کچھ

بھی تو اِس سے باہر نہیں ، ایک ریت کا ذرّہ دوسرے ریت کے ذرے سے نہیں ملتا ، ایک ہی درخت کا پتّا دوسرے پتّے سے نہیں ملتا۔ ہر پتّے کی رگیں دوسرے پتّے سے اسی طرح مختلف ہیں جس طرح ایک انسان کے ہاتھ کی لکیریں دوسرے انسان کے ہاتھ کی لکیروں سے مختلف ہیں اور تو اور بارش کا ہر قطرہ دوسرے قطرے سے مختلف ہے اور پھر کیا یہ بات ہم کو حیرت میں نہیں ڈالتی کہ مٹی اور زمین ایک ہی ہوتی ہے لیکن اس سے قسما قسم کے پھل پھول ، سبزیاں اور اناج نکلتے ہیں اسی زمین سے نیشکر پیدا ہوتا ہے اور اسی سے حنظل ، ایک مٹھاس کی انتہا ہے تو دوسرا کڑواہٹ کی حد۔ الغرض عالم میں جو کچھ موجود ہے اور جو کچھ بھی خالق کے جاری کردہ قوانین کے ماتحت ہو رہا ہے وہ حد درجہ حیرت انگیز ہے اور حقیقت میں سب انسانی علوم خالق کے کمالات کی جستجو کا ہی دوسرا نام ہیں اور ان کے حصول اور تلاش میں یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح قدم قدم پر ہمارے سامنے آتی ہے کہ سب علوم ایک ناپیدا کنار سمندر کی طرح ہیں جس کے کنارے تک ہماری کبھی بھی رسائی نہ ہو گی :۔

علم دریائیست بے حد و کنار   طالبِ علم است غوّاصِ بحار

گر ہزاراں سال باشد عمرِ اُو   او نگردد سیر خود از جستجو

یعنی علم ایک ناپیدا کنار سمندر ہے اور طالب علم اس کے اندر غوطہ زن اور اگر اس کی عمر ہزار سال بھی ہو تو وہ علم کی تلاش میں کبھی سیر نہ ہو۔

قرآن پاک کی آیات قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا[1]۔ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے ہمارے رسول آپ لوگوں کو کہہ دیں کہ اگر ہر ایک سمندر میرے رب کی باتوں کے لکھنے کے لیے روشنائی بن جاتا تو میرے رب کی باتوں کے ختم ہونے سے پہلے ہر ایک سمندر کا پانی ختم ہو جاتا، گو اسے زیادہ کرنے کے لیے ہم اتنا ہی اور پانی سمندر میں لا ڈالتے۔

اس آیت میں خالق کے اسی بے انتہا کمال کا اظہار ہے۔ علم کے حصول میں انسانی کوشش اور جد و جہد جس منزل پر پر بھی پہنچتی ہے وہاں پہنچ کر جس بات کا شدت سے احساس اور سامنا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جو کچھ اس وقت تک معلوم ہوا ہے اس کے مقابلہ میں جو نامعلوم ہے وہ بے حد و حساب ہے اور انسانی علوم کی ترقی ہمیشہ ہی اسی صورت سے دو چار رہیگی۔

---

[1] سورۃ الکہف: ۱۱۰۔

معلومم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

یعنی مجھے یہ معلوم ہوا کہ ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں۔ اور ذوقؔ نے بھی
اسی بات کو یوں ادا کیا ہے :-

اس جہل کا ہے ذوقؔ ٹھکانہ کچھ بھی
دانش نے کیا دل کو نہ دانا کچھ بھی
ہم جانتے تھے علم سے کچھ جانیں گے
جانا تو یہ جانا کہ نہ جانا کچھ بھی

الغرض کمال کا یہ عالم حق تعالیٰ کے سوا بھلا اور کہاں نظر آتا ہے۔ قرآن پاک انسان کو بار بار انفس و آفاق میں غور کرنے کی دعوت دیتا ہے اور یہ ناممکن ہے کہ انسان غور کرے اور اس کا دل اس صاحبِ کمال کی محبت سے بھر نہ جائے جس کے دستِ قدرت سے یہ سب کچھ عالمِ وجود میں آیا ہے، کیونکہ کمال سے محبّت انسان کی فطرت کا خاصہ ہے۔

حق تعالیٰ کی محبّت کا انکار کرنے والوں کے لیے کیا یہ سمجھنا کچھ مشکل ہے کہ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کی قدرتوں پر غور وفکر کی جو قرآن پاک میں تلقین ہے اس کی غرض ہمارے سینوں میں اس کی محبت کا چراغ روشن کرنا ہی ہے کیونکہ کمال کا سچّا احساس یقیناً ہمارے دل میں صاحبِ کمال کی محبّت کو موجزن کرتا ہے :-

عشقِ من پیدا و معشوقم نہاں
یار بیروں فتنۂ او در جہاں

یعنی میرا عشق ظاہر ہے لیکن میرا معشوق پوشیدہ ہے اللہ تعالےٰ تو جہاں سے بالا ہے، لیکن اس کی جلوہ گری سارے جہان میں نظر آ رہی ہے۔

چوتھا سبب محبت کا محبّت نفس ہے، ہم میں سے ہر ایک کو اپنی ذات سے محبت ہے اور قدرتی طور سے ہم اپنے کمال اور ترقی کے خواہاں ہیں اور اپنے زوال اور فنا سے خائف ہیں اسی طرح ہم اپنے عزیز و اقارب اور دوستوں سے محبت رکھتے ہیں اور ان کی ترقی اور اقبال کو چاہتے ہیں اور ان کے زوال اور فنا کو ناپسند کرتے ہیں، کیونکہ ہم خوب جانتے ہیں کہ ان کی ترقی اور عروج ایک طرح سے ہمارا اپنا ہی عروج ہے جس قدر ان کا اثر و رسوخ، مال و دولت، قوت اور جتھا بڑھے گا اسی نسبت سے ہماری اپنی شان و شوکت میں اضافہ ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں ان سب سے محبت حقیقت میں اپنی ہی ذات سے محبت ہے اب اپنی ذات سے تو ہم محبت کریں، لیکن جس ذات سے ہمارا وجود اور ہماری بقا اور ہماری سب ترقی اور کمال وابستہ ہے، اس سے محبت نہ کریں تو یہ بالکل ایسا ہی ہوگا کہ ہم دھوپ کو

تو پسند کریں لیکن سورج سے نفرت کریں یا سایہ کے تو ہم خواہاں ہوں لیکن درخت جس کا سایہ ہے اس سے ہم دُور بھاگیں۔الغرض ہماری اپنی ذات سے محبت اور ہمارا اپنا کمال اور بقا یہ تقاضا کرتا ہے کہ ہم حق تعالیٰ سے محبّت کریں کیونکہ اسی کی ذات ہے جس نے ہم کو پیدا کیا ، رزق دیا ، ہماری سب حاجتیں پوری کیں ، سب زیب و زینت اور راحت کے سامان مہیّا کیے حتّٰی کہ دنیا جہاں کی سب اشیاء ہمارے لیے مسخّر کردیں اور یہ ہرگز کسی اپنے فائدے کے لیے نہیں ، بلکہ محض ہم پر کرم کی خاطر۔

من نہ کردم خلق تا سُودے کنم
بلکہ تا بر بندگاں جُودے کنم

یعنی انسانوں کو میں نے اس لیے پیدا نہیں کیا کہ میں ان سے خود کچھ فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہوں بلکہ اس لیے پیدا کیا ہے کہ تا ان پر اپنا جود و کرم کروں۔

اب ایسے محسنِ عظیم کو محسن نہ جاننا اور اس سے محبت نہ کرنا جہالت کی بیّن دلیل نہیں تو اور کیا ہے ؟

محبّت کے جس قدر بھی محرکات اور اسباب ہو سکتے ہیں ان کی رُو سے ہم نے عقلی طور پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ حق تعالےٰ کے سوا کوئی دوسرا وجود انسان کی محبت کا اس جیسا حقدار نہیں ہو سکتا ، لیکن آئیے اب ہم

قرآن پاک اور حدیث کی روشنی میں بھی اس مسئلہ کا جائزہ لیں۔ اور ایسا کرتے ہوئے یہ بھی دیکھیں کہ اگر بندے سے حق تعالےٰ کی محبّت ثابت اور فرض ہے تو کیا حق تعالیٰ بھی بندے سے محبّت کرتا ہے، سو جاننا چاہیئے کہ قرآن پاک اور حدیث کی رُو سے جس طرح بندہ کی حق تعالےٰ سے محبّت فرض اور ثابت ہے اسی طرح حق تعالےٰ کی بندوں سے محبت بھی ثابت ہے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالےٰ اپنی ذات کے متعلق فرماتا ہے وَاللّٰہُ شَکُوْرٌ حَلِیْمٌ۔ کہ اللہ بہت ہی قدر دان اور ہر بات کو سمجھنے والا ہے۔ اب وہ ذات جو حد سے زیادہ مہربان اور قدردان ہے اس کے بارہ میں کیا یہ بھی سوچا جا سکتا ہے کہ انسان تو اس کے لیے اپنے سینہ میں محبت کا ایک طوفان بسا رکھے لیکن وہ جواب میں اس سے ایسا سلوک نہ کرے جو ایک محبت کرنے والا دوسرے محبت کرنے والے سے کرتا ہے ؎

خدا پر تو پھر یہ گماں عیب ہے کہ وہ راحم و عالم الغیب ہے

پہلے ہم حق تعالیٰ سے بندے کی محبّت کے سلسلہ میں قرآن پاک کی آیات پیش کرتے ہیں:۔

قرآن پاک نے جابجا اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ بندے اور

خالق کا رشتہ محبّت کا رشتہ ہے اور مجود حقیقی صرف معبود ہی

نہیں بلکہ محبوب حقیقی بھی ہے اور قرآن پاک کی مندرجہ ذیل آیات اس سلسلہ میں بالکل واضح اور قطعی ہیں۔

۱۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ[1]

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے انسانوں میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو دوسری ہستیوں کو اللہ کا ہم پلّہ بنا لیتے ہیں اور وہ انہیں اس طرح چاہنے لگتے ہیں جس طرح اللہ کو چاہنا ہوتا ہے، حالانکہ جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں ان کی زیادہ سے زیادہ محبت صرف اللہ ہی کے لیے ہوتی ہے۔

۲۔ پھر فرماتا ہے قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝[2] (یعنی اے پیغمبر لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر واقعی تم اللہ سے محبّت رکھنے والے ہو تو چاہیئے کہ میری پیروی کرو (میں تمہیں محبّت کی حقیقی راہ دکھا رہا ہوں) اگر تم نے ایسا کیا تو (صرف یہی نہیں ہوگا کہ تم اللہ سے محبّت کرنے والے ہو جاؤ گے بلکہ خود) اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بخشنے والا رحمت والا ہے۔

غور کیجیے کہ کس زور سے اس آیت میں محبت الٰہی کی تلقین

---

[1] سورۃ البقرہ: آیت ۱۶۵ + [2] سورۃ آل عمران: آیت ۳۱ +

ہے اور اُسے حاصل کرنے کا گُر بیان کیا گیا ہے۔

اتباعش سینہ نورانی کند
باخبر از یارِ پنہانی کند

یعنی رسول پاکؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی سینہ کو نورانی کرتی ہے۔ اور اس مخفی دوست (یعنی شان تعالےٰ) سے باخبر بناتی ہے۔

پھر قرآن پاک بار بار اس بات کو واضح کرتا ہے کہ ایمان باللہ کا نتیجہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور محبوبیت ہے۔

۳- یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗٓ[1]۔

یعنی اے پیروانِ دعوت ایمانی اگر تم میں سے کوئی اپنے دین کی راہ سے پھر جائے گا تو وہ یہ نہ سمجھے کہ دعوت حق کو اس سے کچھ نقصان ہوگا، عنقریب اللہ ایک گروہ ایسے لوگوں کا پیدا کردے گا جنہیں اللہ کی محبت حاصل ہوگی اور وہ اللہ کو محبوب رکھنے والے ہوں گے۔

پھر بندے کے لیے خدا کی محبت کی عملی راہ کی یوں نشاندہی کی ہے:-

۴- وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ[2]- جو اپنا مال اللہ کی محبت میں خرچ کرتے ہیں۔

---

[1] سورۃ مائدہ آیت ۵۵ + [2] سورۃ البقرہ آیت ۱۷۷۔

۵ - اور پھر فرمایا: وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا ○ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ○[1]
اور اللہ کی محبت میں وہ مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھلاتے ہیں (اور کہتے ہیں) ہمارا کھلانا اس کے سوا کچھ نہیں کہ محض اللہ کے لیے ہے، ہم تم سے نہ تو کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ کسی طرح کی شکر گذاری۔

۶ - اور پھر فرمایا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔ یعنی جو مومن ہیں ان کو اللہ کے ساتھ نہایت قوی محبت ہے۔

۷ - اور پھر فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ○[2]
یعنی جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے عمل کیے اللہ تعالےٰ ان سے محبت پیدا کرے گا، یعنی ان کے دل میں اپنی محبت ڈال دیگا۔

اب ہم حق تعالیٰ کی بندوں سے محبت کے سلسلہ میں قرآن پاک کی وہ آیات پیش کرتے ہیں جن سے یہ ثابت ہے کہ بندوں کو حق تعالیٰ کی محبت کی نعمت ملتی ہے:۔

چنانچہ فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۔ (بقرہ) اللہ محسنوں سے محبت کرتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ۔ (بقرہ) اللہ ان لوگوں سے جو اس کی طرف جھکتے ہیں محبت کرتا ہے

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ۔ (توبہ) اللہ پاکیزگی اختیار کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ (آل عمران) اللہ اس پر توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

---

[1] الدہر آیت ۹-۱۰۔ [2] سورۃ مریم آیت ۹۷۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ۔ (توبہ) اللہ متقیوں سے محبت کرتا ہے۔
اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ۔ (صف) اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کے راستے میں جہاد کرتے ہیں۔
وَاللّٰہُ یُحِبُّ الصَّابِرِیْنَ (آل عمران) اللہ صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

قرآن پاک کی ان صریح آیات کے ہوتے ہوئے کیا اس امر میں رتی بھر بھی شبہ کی گنجائش ہو سکتی ہے کہ حق تعالےٰ اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے اور ہر بندہ پر اس سے محبت کرنا فرض ہے۔ قرآن پاک میں حق تعالےٰ کی جن صفات پر سب سے پہلے انسان کی نظر پڑتی ہے وہ رحمان اور رحیم ہے یعنی رحم والا مہربان اور لطف و کرم والا۔ پھر قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے قُلِ ادْعُوا اللّٰہَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی[1]۔ یعنی خدا تعالےٰ کو محبوب کہو یا مہربان کہو، جو کہہ کر بھی اسے پکارو، اس کے سب ہی نام اچھے ہیں۔ پھر قرآن پاک میں بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ بار بار آتا ہے اور اس کے بار بار تکرار کے علاوہ پچاس سے زائد مقامات پر خدا تعالیٰ کو اسی نام سے پکارا گیا ہے۔ سورۃ البروج میں ایک نام اَلْوَدُوْدُ آیا ہے اور اس کے معنے محبوب اور پیارے کے

---

[1] سورۃ بنی اسرائیل آیت ۱۱۰

ہیں ۔ ایک نام ولی ہے جس کے معنی یار اور دوست کے ہیں،
اگر ہم قرآن پاک اور حدیث میں حق تعالےٰ کے جو صفاتی نام
ہیں ان پر غور کریں تو ان میں کثیر تعداد انہی ناموں کی ہے۔
جن میں اس کے رحم وکرم مہر ومحبّت کا ہی بیان ہے وجہ یہ
کہ صفت رحمت کو ام الصّفات کا درجہ حاصل ہے جس کا ہر لحظہ
دنیا میں ظہور ہے، اگرچہ اس کی صفت غضَب کا اظہار بھی
حقیقت میں رحمت کا ہی اظہار ہے۔ غضَب حق تعالیٰ کی ذاتی
اور بنیادی صفت نہیں، ظاہر ہے کہ اگر سرکشی اور نافرمانی کا
دنیا سے وجود مٹ جائے تو صفتِ غضَب کا بھی ظہور نہ ہو،
پھر قرآن پاک اور حدیث میں حقِ تعالیٰ کے جو مختلف نام ہیں
ذرا ان کو تو دیکھو، مثلاً اس کا ایک نام غفّار ہے یعنی بخشش
کرنے والا، پھر دُوسرا نام غفور ہے یعنی بخشنے والا، تیسرا نام
سلاَم ہے یعنی امن و سلامتی دینے والا، اور چوتھا نام العفو
ہے یعنی معاف کرنے والا، پھر پانچواں نام وہاّب ہے یعنی
عطا کرنے والا، پھر چھٹا الحکیم ہے یعنی برُد بار، پھر ساتواں
الصبوَر ہے یعنی بندوں کی گستاخی پر صبر کرنے والا، پھر آٹھواں
التواَب ہے یعنی بندوں کے حال پر رجوع برحمت ہونے والا۔
پھر نواں نام اَلبَرُّ ہے یعنی مجسّم خیر۔ الغرض جب ہم حق تعالیٰ

کے اسمائے حسنہ کو دیکھتے ہیں تو بندوں سے مہر و محبّت اور
رحم و کرم کے سوا بھلا اور کیا نظر آتا ہے؟

قرآن پاک کے بعد آئیے ذرا احادیث نبوی کی روشنی میں ہم
اصل حقیقت کا جائزہ لیں:۔

رسول پاکؐ نے حق تعالیٰ سے محبّت کرنے کا حکم دیا ہے۔
چنانچہ فرماتے ہیں۔ اَحِبُّوا اللّٰہَ لِمَا یَغْذُوْکُمْ بِہٖ مِنْ نِّعْمَتِہٖ وَاَحِبُّوْنِیْ لِحُبِّ
اللّٰہِ (ترمذی بروایت ابن عباس) یعنی تم اللہ سے محبّت اس وجہ سے کرو کہ
وہ تم کو ہر صبح اپنی نعمت سے سرفراز کرتا ہے اور مجھ سے اس لیے
محبت کرو کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ پھر رسول پاکؐ
محبت الٰہی کو شرطِ ایمان قرار دیتے ہیں۔ ایک شخص نے آپؐ سے
سوال کیا مَا الْاِیْمَانُ؟ کہ ایمان کی تعریف کیا ہے۔ آپ نے فرمایا
اَنْ یَّکُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلُہٗ اَحَبَّ اِلَیْکَ مِمَّا سِوَاھُمَا۔ اللہ اور اس کے رسول
تیرے نزدیک ما سوا سے زیادہ محبوب ہو جانا ایمان ہے۔
بخاری اور مسلم میں بروائت انسؓ آتا ہے لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ
حَتّٰی یَکُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلُہٗ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِمَّا سِوَاھُمَا۔ یعنی تم میں سے کوئی
مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اللہ اور اس کا رسول اس کے نزدیک
ما سوا سے زیادہ محبوب نہیں ہو جاتے۔ پھر رسول پاک کی ان دعاؤں پر غور کریں جن میں آنحضرت
نے محبت الٰہی کے حصول پر خاص طور پر زور دیا، آپ فرماتے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ

حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ اَحَبَّكَ وَحُبَّ مَا يُقَرِّبُنِىْ اِلٰى حُبِّكَ وَاجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ اِلَیَّ مِنَ الْمَآءِ الْبَارِدِ۔ (ترمذی حاکم) یعنی الٰہی مجھ کو اپنی محبت عطا کر اور اس کی محبّت عطا کر جو تجھے چاہتا ہے اور اس شے کی محبت جو تیری محبت سے مجھے قریب کر دے اور اپنی محبت کو میرے لیے آبِ خنک سے بھی زیادہ محبوب کر۔ پھر فرماتے ہیں: اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ يَّنْفَعُنِىْ فِىْ حُبِّكَ (ترمذی) یعنی اے حق تعالےٰ تو مجھے اپنی محبّت اور اس کی محبّت جو تیری محبّت کی راہ میں نافع ہو عطا فرما۔ اسی طرح روائت آتی ہے کہ ایک اعرابی رسول پاک کی خدمت میں حاضر ہُوا اور عرض کیا یا رسول اللّٰہ قیامت کب ہو گی؟ آپ نے فرمایا تو نے اس کے لیے کیا سامان کر رکھا ہے اس نے شرمندہ ہو کر عرض کیا کہ "یا رسول اللّٰہ میرے پاس نہ تو نمازوں کا نہ روزوں کا نہ صدقہ و خیرات کا ہی ذخیرہ ہے جو کچھ سرمایہ ہے وہ خدا اور رسول کی محبت کا ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں"، آپ نے فرمایا "اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ" یعنی جو جس سے محبت کریگا وہ اسی کے ساتھ رہے گا۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے مسلمانوں کو اسلام کے بعد کسی چیز سے اتنا خوش ہوتے نہیں دیکھا جتنے وہ اس بات سے خوش ہوئے (بخاری و مسلم بروائت انسؓ) پھر ایک اور روایت آتی ہے کہ ایک دفعہ لڑائی کا میدان گرم تھا

بھائی سے بھائی، ماں بچہ سے، بچہ ماں سے جدا تھا۔ اس حالت میں ایک عورت جس کا بچہ گم ہوگیا تھا آتی ہے اور جو بچہ بھی سامنے آتا ہے اس کو اپنے بچہ کی محبت کے جوش میں اُٹھا لیتی ہے اور چھاتی سے لگا لیتی ہے اور دودھ پلاتی ہے۔ رحمۃٌ للعالمین کی اس عورت پر نظر پڑتی ہے اور صحابہ سے مخاطب ہو کر حضورؐ فرماتے ہیں کہ "کیا یہ ممکن ہے کہ یہ عورت خود اپنے بچے کو اپنے ہاتھ سے دہکتی آگ میں ڈال دے"۔ صحابہ نے جواب دیا "ہرگز نہیں"۔ فرمایا "تو جتنی محبت ماں کو اپنے بچے سے ہے خدا کو اپنے بندوں سے اس سے بھی بہت زیادہ محبت ہے"۔ (صحیح بخاری باب رحمۃ الولد)

اسی طرح روایت آتی ہے کہ ایک دفعہ حضورؐ ایک جنگ سے واپس تشریف لا رہے تھے ایک عورت اپنے بچے کو گود میں لیکر حضور کے سامنے آئی اور عرض کیا "یا رسول اللہؐ ایک ماں کو جتنی محبت اپنی اولاد سے ہوتی ہے کیا خدا تعالےٰ کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ نہیں؟ فرمایا "ہاں بے شک اس سے زیادہ ہے" بولی تو کیا ماں اپنی اولاد کو خود آگ میں ڈالنا گوارا کرے گی؟ یہ سُن کر حضورؐ پر فرط اثر سے گریہ طاری ہوگیا، پھر سر اُٹھا کر فرمایا "خدا صرف اسی بندہ کو عذاب دیتا ہے جو سرکشی سے ایک کو دو کہتا ہے"۔ (سنن نسائی) پھر روایت آتی ہے کہ "حبیبِ خدا ایک مجلس

میں تشریف فرما تھے، ایک صحابی ایک پرندے کو اُس کے بچوں کے ساتھ ایک چادر میں باندھ کر لائے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں نے ایک جھاڑی سے ان بچوں کو اُٹھا کر کپڑے میں لپیٹ لیا، ان کی ماں نے دیکھا تو میرے سر پر منڈلانے لگی میں نے ذرا کپڑے کو کھول دیا تو فوراً میرے ہاتھ پر بچوں پر گر پڑی۔ ارشاد ہوا کہ بچوں کے ساتھ ماں کی اس محبّت پر تم کو تعجب ہے؟ قسم ہے اُس ذات کی جس نے مجھے حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے جو محبت اس ماں کو بچوں کے ساتھ ہے خدا کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے بدرجہا زیادہ ہے۔ (مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد باب رحمۃ اللہ)

کیا مندرجہ بالا آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ سے صاف طور سے ثابت نہیں ہوتا کہ حق تعالےٰ اپنے بندوں سے محبّت کرتا ہے اور بندوں کو حق تعالےٰ سے محبت ہوتی ہے، خدا تعالیٰ سے محبّت کا انکار کرنے والوں کو غور کرنا چاہیئے کہ اُن کے خود تراشیدہ اعتراضات کیسے دُرست ہو سکتے ہیں اور خدا تعالےٰ کی محبت سے صرف اطاعت مراد لینا بھلا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کیونکہ اطاعت تو محبّت کا ثمرہ اور محبت کے پیدا ہونے کے بعد کی شے ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ حق تعالیٰ کا محبت کرنا لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ کے ماتحت انسانوں کے محبت کرنے کی طرح ہرگز

نہیں ہو سکتا، حق تعالےٰ کے محبت کرنے سے مراد صرف اس قدر ہے کہ جو سلوک ایک محبت کرنے والا دوسرے محبت کرنے والے سے کرتا ہے اسی قسم کا سلوک حق تعالےٰ اُن بندوں سے روا رکھتا ہے جن کو اس کی محبت کی نعمت حاصل ہوتی ہے اور یہی صورت اس کی ناراضگی اور غضب کی ہے۔ انسان جب ناراض ہوتا ہے تو اس کی ناراضگی خود اس کے لیے تکلیف کا باعث بنتی ہے۔ طیش کے وقت انسان کا ذہنی سکون غصہ اور ہیجان کی نذر ہو کر اس کے چین کو برباد کر دیتا ہے، لیکن حق تعالےٰ اس سے پاک ہے کہ بندے اپنی نافرمانی سے اس کے ابدی سرور میں رخنہ ڈال سکیں۔ اس لیے خدا تعالےٰ کے غضب کا مطلب صرف اسی قدر ہے کہ جب وہ کسی نافرمان کو اس کے بُرے عمل کی سزا دیتا ہے یعنی اس کے اپنے ہی اعمال کا طبعی نتیجہ اس کے سامنے رکھ دیتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس نے اس پر غضب کیا ہے۔

شاید یہ اعتراض کیا جائے کہ قرآن پاک میں جو دوزخ اور اس کی مختلف سزاؤں اور ان میں حد درجہ سختی کا ذکر آتا ہے وہ بھلا خدائے رحمان کی جو تصویر ہم نے پیش کی ہے اس سے کیسے مطابقت رکھتا ہے۔ سو اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ قرآن پاک کی کسی بھی آیت سے یہ ہرگز ظاہر نہیں کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں

کو سزا اور عذاب دے کر خوش ہوتا ہے یا مطلق العنان جابر بادشاہوں کی طرح جس کو چاہتا ہے خوش ہو کر انعام دے دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ناراض ہو کر سزا۔ ایسا خیال قرآن کی پاک تعلیم کے صریح خلاف ہے۔ قرآن پاک نے جزا اور سزا کا جو فلسفہ بیان کیا ہے اور جس کے نتیجہ میں انسان دوزخ اور جنت میں جاتا ہے وہ حد درجہ حکیمانہ اور فطرت کے قوانین کے عین مطابق ہے۔ مثلاً کیا یہ نظر نہیں آتا کہ دنیا میں ہر شے اپنی ایک تاثیر اور اثر رکھتی ہے۔ آگ کی تاثیر جلانا ہے، پانی کی ٹھنڈا کرنا ہے، زہر کی ہلاک کرنا اور تریاق کی زہر کے اثر کو زائل کرنا ہے۔ الغرض دنیا میں کوئی شے بھی نہیں جو اپنے مقررہ خواص کے بغیر ہو اور اگر دنیا میں خواص الاشیاء اور ان کے اثرات کا یہ حکیمانہ قانون جاری نہ ہوتا تو کارخانۂ ہستی کسی صورت سے نہ چل سکتا۔ مثلاً حرارت کے لیے جب ہم کو آگ کی ضرورت ہوتی اور ہم ایندھن فراہم کر کے آگ جلاتے لیکن حرارت کی جگہ کوئی ایسی انوکھی تاثیر نمودار ہو جاتی جس کا ہم کو وہم بھی نہ ہوتا، تو مہماتِ زندگی بھلا اس صورت میں کیونکر سرانجام پاتیں۔

اشیاء میں ان کے مقرر کردہ خواص کا موجود ہونا اور ہر بار انہی خواص کا ظہور خالق کا ایسا حکیمانہ قانون ہے کہ اس کے بغیر نہ تو

زندگی ممکن ہوتی اور نہ اس میں نظم وضبط اور ترقی اور نشو ونما۔
اب جس طرح مادے کی دنیا میں یہ ناممکن ہے کہ کوئی شے موجود
تو ہو، لیکن اثرات اور نتائج کے سلسلہ سے باہر ہو اسی طرح اعمال
کی دنیا میں بھی خواص اور نتائج ہیں یعنی ہر عمل کا ایک مقررہ اثر اور
نتیجہ ہے یعنی اچھے عمل کا اچھا نتیجہ ہے اور بُرے عمل کا بُرا نتیجہ۔
اور اگر یہ نہ ہوتا تو جس طرح مادی دنیا میں خواص الاشیاء کے
قانون کے بغیر کچھ بھی ممکن نہ تھا ہمارے اعمال کی دنیا بھی اسی
قانون کے بغیر بے حقیقت ہو جاتی کیونکہ اگر بُرا عمل بھی کسی وقت
اچھا نتیجہ پیدا کر دیتا یا اچھا عمل بُرا، تو پھر اعمال کی کیا حقیقت رہتی؛

اب قرآن پاک میں جو جنّت اور دوزخ کا بار بار ذکر ہے وہ
اعمال کے اسی خاصہ کا اظہار ہے یعنی اچھے عمل کا نتیجہ اچھا ہے اور
یہ ثواب ہے اور بُرے عمل کا نتیجہ بُرائی ہے اور یہ عذاب ہے اور
اوّل الذکر کا نقشہ جنت اور جنت کی نعما کے رنگ میں قرآن پاک
میں پیش کیا گیا ہے اور مواخر الذکر کا دوزخ اور دوزخ کے عذاب
کی صورت میں، لیکن جنت اور دوزخ کی اصل حقیقت کیا ہے یہ
اس دنیا میں جیسے کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں انسان کے ادراک اور فہم
سے باہر ہے۔ الغرض قرآن پاک میں جو بار بار دوزخ اور دوزخ کی
سزاؤں کا ذکر ہے وہ بُرے اعمال کی تاثیر کا ہی بیان ہے اور

انسان کو متنبہ کرنے کے لیے حق تعالیٰ نے بار بار اور قدم قدم پر اپنی رحمت کے سبب اس کا اعادہ کیا ہے تا انسان بُرائی سے پرہیز کر کے خود کو اس کے خوفناک طبعی نتائج سے بچا لے۔ اب کوئی شخص اس حقیقت کو نہ سمجھے اور دوزخ اور اس کی سزاؤں کا جو قرآن پاک میں بار بار بیان آتا ہے اس کی بنا پر اپنے ذہن میں حق تعالیٰ کا ایک غلط تصوّر قائم کر لے تو اس میں قصور کس کا ہے؟ سُبحَانَ اللّٰہِ عَمَّا یَصِفُوْنَ۔ اور اگر یہ اعتراض پیدا ہو کہ کیوں اعمال کی جزا اور سزا ہم رنگ نہیں، یعنی کی گئی تو عبادت، لیکن ملی اس کے بدلہ میں جنّت، اور عبادت اور باغ و بہار کی جنس تو ایک نہ ہوئی، لیکن کیا اس دنیا میں فعل اور جزا ہم رنگ ہوتے ہیں؟ مثلاً ایک آدمی پتھر اور اینٹیں ڈھوتا ہے لیکن بدلے میں اُسے چاندی کے سکّے ملتے ہیں، یعنی اس کا اینٹیں ڈھونے کا فعل چاندی کے سکّے بن جاتا ہے اور اگر اس پر اعتراض نہیں تو آخرت کی جزا و سزا کے ہم رنگ نہ ہونے پر کیسے اعتراض ہو سکتا ہے خاص کر جب وہاں کی جزا اور سزا خالق کی صفت خالقیت اور ربوبیت کا ایک یکسر نیا اور انوکھا اظہار بھی ہو جیسے کہ قرآن پاک میں آخرت کے متعلق ارشاد ہے کہ نُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (الواقعہ آیت ۶۲)

کہ ہم تم کو کسی ایسی صورت میں پیدا کر دیں کہ جس کو تم نہیں جانتے۔

چونکہ آخرت کی زندگی میں جنت یا دوزخ انسانی اعمال کے نتیجہ میں معرض وجود میں آتے ہیں اس لیے قرآن پاک کی ان آیات کا ذکر یہاں ضروری ہوگا۔ جو انسانی اعمال اور اُن کے ضبط کے قوانین کی آئینہ دار ہیں، قرآن پاک میں حق تعالٰے فرماتا ہے: فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ ؕ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ ۝ (الزلزال: ۸ و ۹)

یعنی جو شخص ذرہ بھر نیکی کرے گا دیکھ لے گا اور جو شخص ذرہ بھر بُرائی کرے گا دیکھ لے گا۔ اسی طرح ارشاد ہوتا ہے وَوُفِّیَتْ کُلُّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ وَھُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ۝ (آل عمران ۲۵) یعنی ہر جان جو کچھ کمائے گی اس کا پورا بدلہ پائے گی اور اس کے ساتھ کوئی بے انصافی نہ کی جائے گی اور ان سے ذرہ بھر ظلم نہ کیا جائے گا۔ اور پھر لَا یَلِتْکُمْ مِّنْ اَعْمَالِکُمْ شَیْئًا (حجرات) یعنی خدا تمہارے اعمال میں ذرہ بھر کمی نہ کرے گا۔ اور ضبط اعمال کے متعلق حق تعالیٰ فرماتا ہے وَکُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ ...... اِقْرَاْ کِتٰبَکَ ؕ کَفٰی بِنَفْسِکَ الْیَوْمَ عَلَیْکَ حَسِیْبًا ۝ (بنی اسرائیل: ۱۴-۱۵)

یعنی ہر انسان کے اعمال ہم نے اس کی گردن میں لٹکا دیئے ہیں۔ (بالفاظ دیگر نحوست اور سعادت کی فال انسان کی گردن میں لٹکا دی گئی ہے) اپنی سرگزشتِ اعمال خود پڑھ لے آج تو اپنے اعمال کا محاسبہ کرنے کے لیے خود کافی ہے۔ غور کریں کہ کس وضاحت سے یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ انسان کے اعمال

خود اس کی فطرت کی قوتیں ہی لکھتی ہیں اور پھر اس نامہ اعمال کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ مَا لِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّكَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا (الکہف:۴۹) یعنی یہ تحریر عجیب ہے کہ کوئی کام چھوٹا ہو یا بڑا، ایسا نہیں کہ اس کا ذکر اس میں نہ ہو۔

الغرض ہر عمل انسانی خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، اچھا ہو یا بُرا صادر ہونے کے بعد نفسِ انسانی پر پتھر کی لکیر کی طرح نقش ہو جاتا ہے اور عالمِ آخرت میں یعنی جزا اور سزا کے وقت یہ نقش شدہ عمل اپنا اثر اور تاثیر دکھانا شروع کر دیتا ہے، یعنی اس کی لطافت یا کثافت جو اس دنیا میں چھپی ہوئی تھی ظاہر و باہر ہو جاتی ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ مادی دنیا میں خواص الاشیا کا قانون تو اٹل اور بے رحم ہے یعنی ہر حالت میں اپنا کام کرتا ہے لیکن عالمِ آخرت میں جزا اور سزا کا قانون حق تعالیٰ کی بخششِ بے پایاں اور رحمتِ بے کراں کے تابع ہے جس کے متعلق ناامیدی کو جرم اور مایوسی کو گناہ قرار دیا گیا ہے اور گنہگار سے گنہگار بندوں کو "یَا عِبَادِیَ" یعنی میرے بندو کہہ کر تسلّی کا پیغام دیا ہے۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ (زمر ۵۴) اور پھر هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۔ (زمر) یا کَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (انعام ۵۵) اور پھر ہر چیز کو اپنی رحمت کی

وسعت کے اندر قرار دیکر جیسا کہ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ سے ظاہر ہے۔ انسانوں کو ایک ایسا جانفزا مژدہ سنایا ہے کہ اس کے بعد بھلا پھر اور کس مژدہ کی حاجت باقی رہتی ہے ؟ اور پھر اس کی رحمت اور بخشش اس قدر عام ہے کہ ہر مانگنے والے کے لیے ہر وقت اس کے دروازے کھُلے ہیں اور اس نے خود بیان کر دیا ہے کہ یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ وَ عِنْدَہٗٓ اُمُّ الْکِتٰبِ۔ یعنی جس عمل کو وہ چاہے محو کر دے اور جس کو چاہے قائم رکھے اور اسی طرح فرمایا ہے کہ اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّئَاتِ کہ نیکی بُرائیوں کو ختم کر دیتی ہے ۔جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی رحمت سے نہ صرف برائیاں ختم ہو جاتی ہیں بلکہ اُن کا نشان تک باقی نہیں رہتا اور اس نسخہ پر عمل کرنا خود انسان کے دائرۂ اختیار میں رکھا گیا ہے۔ الغرض قرآن پاک میں حق تعالیٰ کی رحمت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجزن نظر آتا ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ ایک کور چشم اور کور باطن انسان کو اس کے اپنے اندھے پن کی وجہ سے یہ نظر نہ آئے ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

یعنی اگر دن کے وقت کمزور نظر کچھ نہ دیکھ سکے تو اس میں سورج کا کیا قصور ہے۔

حق تعالیٰ کی بندوں سے محبت اور بندوں کی حق تعالےٰ سے محبت از روئے

قرآن وحدیث ہم اوپر ثابت کر آئے ہیں۔ آیئے اب ہم قرآن پاک و حدیث کی روشنی میں یہ دیکھیں کہ کیا ہم اس محبوب حقیقی کے دیدار اور اور وصال سے بھی فیضیاب ہوں گے۔ سو اس سلسلہ میں قرآن پاک کی مندرجہ ذیل آیات بڑی صاف اور واضح ہیں۔ فرماتا ہے:۔

۱۔ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ ٥ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ٥ (سورۃ القیامۃ آیت ۲۳-۲۴)

یعنی اس دن بعض لوگ ہشاش بشاش ہوں گے اپنے خدا کی طرف نظر لگائے بیٹھے ہونگے۔

۲۔ (سورۃ انشقاق آیت ۷) میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ ٥ یعنی اے انسان تو اپنے رب کی طرف سخت کوشش کر کے پہنچنے والا پھر اسے ملنے والا ہے۔

۳۔ (سورۃ سجدہ آیت ۱۱) میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَقَالُوا أَإِذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ أَإِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ٥ بَلْ هُم بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ كَافِرُونَ ٥ یعنی وہ کہتے ہیں کہ ہم زمین میں کھوئے جائیں گے تو ہمیں ایک نئی مخلوق کی شکل میں کھڑا کیا جائے گا۔ بلکہ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔

۴۔ سورۃ المطففین آیت ۱۶-۱۷) میں فرمایا كَلَّا إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ ٥ ثُمَّ إِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيمِ ٥ بلکہ یوں کہو کہ اس دن وہ اپنے رب کے سامنے آنے سے یقیناً روکے جائیں گے، پھر وہ ضرور

جہنم میں داخل ہونگے۔" غور کریں اللہ تعالےٰ کی ملاقات سے محرومی کو یہاں دوزخ میں داخل ہونا قرار دیا گیا ہے۔

۵- (سورۃ یونس آیت ۸ و ۹) میں فرمایا اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوۡا بِالۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَاطۡمَاَنُّوۡا بِہَا وَالَّذِیۡنَ ہُمۡ عَنۡ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوۡنَ ۙ اُولٰٓئِکَ مَاۡوٰىہُمُ النَّارُ بِمَا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ ۙ یعنی جو لوگ ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے اور اس ورلی زندگی پر راضی ہو گئے ہیں اور اس پر انہوں نے اطمینان پکڑ لیا ہے اور (پھر) جو لوگ ہمارے نشانوں کی طرف سے غافل ہو گئے ہیں ان سب کا ٹھکانا ان کی کمائی کی وجہ سے دوزخ کی آگ ہے۔

۶- اسی طرح (سورۃ یونس آیت ۱۲) میں آتا ہے فَنَذَرُ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا فِیۡ طُغۡیَانِہِمۡ یَعۡمَہُوۡنَ ۙ یعنی اس لیے ہم ان لوگوں کو جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے اس حالت میں چھوڑ رہے ہیں کہ وہ اپنی سرکشی میں سرگرداں پھرتے رہیں۔

۷- (سورۃ عنکبوت آیت ۲۴) میں فرمایا ہے وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَلِقَآئِہٖۤ اُولٰٓئِکَ یَئِسُوۡا مِنۡ رَّحۡمَتِیۡ وَاُولٰٓئِکَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ۙ یعنی وہ لوگ جو اللہ کے نشانوں کا اور اس سے ملاقات ہونے کا انکار کرتے ہیں وہ لوگ ایسے ہیں جو میری رحمت سے مایوس ہو گئے ہیں اور وہ ہی ہیں جن کو دردناک عذاب ملے گا۔ غور کریں یہاں اپنی ملاقات

کو اپنی رحمت قرار دیا ہے۔

۸ - (سورۃ روم آیت ۸-۹) میں فرمایا یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۖ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ اَوَلَمْ یَتَفَكَّرُوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَاِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ۝ یعنی وہ لوگ دنیا کی زندگی کے ظاہر (یعنی اس کی شان و شوکت) کو تو خوب سمجھتے ہیں، لیکن اخروی زندگی سے بالکل ناواقف ہیں۔ کیا انھوں نے اپنے دل میں کبھی غور نہیں کیا کہ آسمانوں اور زمین کو جو کچھ ان کے درمیان ہے خدا نے کس حکمت مطابق اور ایک وقتِ مقررہ کے لیے پیدا کیا ہے، لیکن لوگوں میں سے اکثر اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔

۹ - (سورۃ بقرہ آیت ۴۶-۴۷) میں فرماتا ہے وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِیْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِیْنَ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ یعنی صبر اور دعا کے ذریعہ (اللہ سے) مدد مانگو اور بے شک فروتنی اختیار کرنے والوں کے سوا (دوسروں کے لیے یہ امر) مشکل ہے (وہ فروتن) جو (اس بات پر) یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور اس بات پر بھی کہ وہ اس کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

۱۰ - سورۃ کہف آیت ۱۰۷ میں فرمایا اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ

وَلِقَائِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۝ یعنی وہ
لوگ جنہوں نے اپنے ربّ کے نشانوں کا اور اس سے ملنے کا انکار
کر دیا ہے اس لیے ان کے (تمام) اعمال گر کر (اسی دنیا میں)
رہ گئے ہیں، چنانچہ قیامت کے دن ہم ان کو کچھ وقعت نہ
دیں گے۔

۱۱۔ پھر سورۃ قمر آیت ۵۵ میں فرمایا اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ ۝
فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ۝ مومن جنتوں میں اور قسم قسم کی
فراخیوں میں ہونگے، ایک ایسے مقام میں جو دائمی رہنے والا ہوگا۔
اور وہ قدرت رکھنے والے بادشاہ کے پاس ہونگے۔

۱۲۔ سورۃ الکہف آیت ۱۱۱ میں فرمایا قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ
اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ
بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝ یعنی تو (انہیں) کہہ دے کہ میں صرف تمہاری طرح کا ایک
بشر ہوں فرق صرف یہ ہے کہ میری طرف یہ وحی نازل کی جاتی
ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی حقیقی معبود ہے۔ بس جو شخص اپنے ربّ
سے ملنے کی امید رکھتا ہو اسے چاہیئے کہ نیک اور مناسب حال
کام کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

احادیث میں آتا ہے کہ رسول کریمؐ نے فرمایا سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ كَمَا
تَرَوْنَ هٰذَا الْقَمَرَ۔ یعنی تم جیسے آسانی سے اس چاند کو دیکھتے ہو، اسی

طرح اپنے رب کا دیدار بھی کر سکو گے۔

کیا مندرجہ بالا آیات قرآنیہ اور فرمان رسول پاکؐ کے بعد یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح نہیں ہو جاتی کہ انسانی زندگی کی اصل غرض حق تعالیٰ کا دیدار یعنی اُس کے حسن و جمال سے فیضیاب ہونا ہی ہے۔ اس میں کیا شک ہو سکتا ہے کہ عشق و محبّت بھرے دل سے ایسے اعمال بجا لانا جو اسے پسند ہوں ہی وہ ایک ذریعہ ہے جس سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے اور یہی اسلام کی تعلیم کا لبِ لباب ہے، جو لوگ اطاعت اور اعمال کو ہی اسلام کی تعلیم کا مغز خیال کرتے ہیں اور عشق و محبت کی ان کے نزدیک کوئی گنجائش نہیں، ان سے ہم پوچھتے ہیں کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی آخر اُن کے نزدیک کیا حکمت ہے؟ کیا وہ سمجھتے ہیں کہ حق تعالےٰ کو بھی مجازی سلاطین کی طرح بندوں کی اطاعت اور فرمانبرداری کی حاجت ہے؟ یعنی اگر وہ اس کی اطاعت نہ کریں گے تو اس کی حکومت متزلزل ہو کر ختم ہو جائے گی ہرگز نہیں، حق تعالےٰ بندوں کی پرستش اور فرمانبرداری سے بکلی بے نیاز ہے۔

من نہ گردم پاک از تسبیحِ شاں
پاک ہم ایشاں شوند و درفشاں

یعنی میں ان کی تسبیح سے پاک نہیں بلکہ یہ خود پاک ہوتے ہیں۔

قرآن پاک کی مندرجہ ذیل آیات اس بارہ میں قطعی ہیں، فرمایا:۔
مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝
(حٰمٓ السجدۃ آیت ۴۷) یعنی جس نے نیک کام کیا تو اپنے لیے کیا اور جس نے برائی کی تو خود اس کے آگے آئے گی اور ایسا نہیں ہے کہ تمہارا پروردگار اپنے بندوں کے لیے ظلم کرنے والا ہو۔ پھر فرمایا: فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ یعنی اللہ تو جہان سے بے نیاز ہے۔ کیا انسانوں کے اعمال جہانوں سے باہر ہیں؟ اسی طرح فرمایا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (البقرۃ: ۲۸۶) یعنی ہر انسان کے لیے وہی ہے جیسی کچھ اس نے کمائی کی ہوگی، جو کچھ اس نے بنانا ہے وہ بھی اس کی کمائی سے اور جس کے لیے اُسے جواب دِہ ہونا ہے وہ بھی اس کی کمائی ہے۔ پھر جس حقیقت کا اظہار اس مشہور حدیث قدسی میں ہے اس پر بھی ذرا غور کریں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
"يَا عِبَادِيْ لَوْ اَنَّ اَوَّلَكُمْ وَاٰخِرَكُمْ وَاِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوْا عَلٰى اَتْقٰى قَلْبِ رَجُلٍ وَّاحِدٍ مِّنْكُمْ مَا زَادَ فِيْ مُلْكِيْ شَيْئًا۔ يَا عِبَادِيْ لَوْ اَنَّ اَوَّلَكُمْ وَاٰخِرَكُمْ وَاِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ كَانُوْا عَلٰى اَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ وَّاحِدٍ مِّنْكُمْ مَا نَقَصَ ذٰلِكَ مِنْ مُلْكِيْ شَيْئًا۔ يَا عِبَادِيْ لَوْ اَنَّ اَوَّلَكُمْ وَاٰخِرَكُمْ وَاِنْسَكُمْ وَجِنَّكُمْ قَامُوْا فِيْ صَعِيْدٍ وَّاحِدٍ فَسَاَلُوْنِيْ فَاَعْطَيْتُ كُلَّ اِنْسَانٍ مَّسْاَلَتَهٗ مَا نَقَصَ ذٰلِكَ مِمَّا

عِنْدِیْ۔ اِلَّا کَمَا یَنْقُصُ الْمِخْیَطُ اِذَا اُدْخِلَ الْبَحْرَ۔ یَا عِبَادِیْ اِنَّمَا ھِیَ اَعْمَالُکُمْ اُحْصِیْھَا لَکُمْ ثُمَّ اُوَفِّیْکُمْ اِیَّاھَا۔ فَمَنْ وَجَدَ خَیْرًا فَلْیَحْمَدِ اللّٰہَ وَمَنْ وَجَدَ غَیْرَ ذٰلِکَ فَلَا یَلُوْمَنَّ اِلَّا نَفْسَہٗ" (مسلم عن ابی)

اے میرے بندو! اگر تم میں سے سب انسان جو پہلے گذر چکے ہیں اور وہ سب جو بعد کو پیدا ہوں گے اور تمام انس اور تمام جن اس شخص کی طرح نیک ہو جاتے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے تو یاد رکھو اس سے میری خداوندی میں کچھ بھی اضافہ نہ ہوتا۔ اے میرے بندو! اگر وہ سب جو پہلے گذر چکے ہیں اور وہ سب جو بعد کو پیدا ہوں گے اور تمام انس اور تمام جن اس شخص کی طرح بدکار ہو جاتے جو تم میں سب سے زیادہ بدکار ہے تو اس سے میری خداوندی میں کچھ بھی نقصان نہ ہوتا۔ اے میرے بندو اگر وہ سب جو پہلے گذر چکے ہیں اور وہ سب جو بعد کو پیدا ہونگے ایک مقام پر جمع ہو کر مجھ سے سوال کرتے اور میں ہر ایک انسان کو اس کی منہ مانگی مراد دیتا تو میری رحمت و بخشش کے خزانوں میں اس سے زیادہ کمی نہ ہوتی جتنی کمی سُوئی کے ناکے جتنا پانی نکل جانے سے سمندر میں ہو سکتی ہے۔ اے میرے بندو! یاد رکھو یہ تمہارے اعمال ہی ہیں جنہیں میں تمہارے لیے انضباط اور نگرانی میں رکھتا ہوں اور پھر ان ہی کے نتائج بغیر کسی کمی بیشی کے تمہیں واپس دے دیتا ہوں۔ پس جو کوئی تم میں

سے اچھائی پائے چاہیئے کہ وہ اللہ کی حمد وثنا کرے اور جس کو برائی پیش آئے تو چاہیئے کہ خود اپنے وجود کے سوا کسی کو ملامت نہ کرے۔"

کیا ان واضح تصریحات کے بعد اعمال کی اصل غرض وغایت کے متعلق کوئی ابہام باقی رہ جاتا ہے؟ تمام اعمال کا مقصد خود انسان کی اپنی ہی ترقی کا حصول ہے مثلاً روزوں کے متعلق حق تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کہ روزوں کی اصل غرض یہ ہے کہ تا تم ان کے ذریعہ تقویٰ حاصل کرو۔ قربانی کے متعلق ارشاد ہے لَنْ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآءُهَا وَلٰكِنْ یَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ[1] یعنی تمہاری قربانی کا گوشت اور خون حق تعالیٰ کو نہیں پہنچتا بلکہ تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ پھر قرآن پاک میں بار بار آتا ہے کہ اِتَّقُوا اللّٰهَ یعنی اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور تقویٰ کا مقصد خود حق تعالیٰ کی ذات ہے اور تقوےٰ اختیار کرنے والوں کو متقی کہا گیا ہے اور ان کی یوں تعریف کی گئی ہے۔

وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ (بقرہ ۱۹۵) کہ جان لو اللہ متقیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ (توبہ آیت ۵۔۸) یقیناً اللہ متقیوں سے محبت رکھتا ہے۔

وَاللّٰهُ وَلِیُّ الْمُتَّقِیْنَ (جاثیہ آیت ۲۰) اللہ متقیوں کا دوست ہے۔

وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ (اعراف ۱۲۹) اچھا انجام متقیوں کا ہی ہوتا ہے۔

---

[1] الحج آیت ۳۸

وَاِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ (ص:۰۰) یاد رکھو کہ متقیوں کے لیے اچھا ٹھکانا ہے۔

بات بالکل صاف اور سیدھی ہے کہ ہم حق تعالےٰ کے قرب کے متلاشی ہیں، تا ہم اپنی زندگی کا اصل مقصد پا سکیں اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ ہم اپنی ذات میں وہ صفات پیدا کریں جو حق تعالےٰ کو پسند ہیں یعنی تمام اچھے اعمال کی غرض انسان کو متقی بنانا اور تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ کے ارشاد کے مطابق اپنے آپ کو اللہ تعالےٰ کے صفات کا مظہر بنانا ہے۔ کیونکہ اس کے نتیجہ میں قدرتی طور سے ہم کو حق تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا۔ ظاہر ہے کہ وہ ذات جو سراسر پاک اور مطہّر ہے اپنے ہی ہم رنگ صفات کو پسند کر سکتی ہے اور جو بھی اس جیسی صفات کا حامل ہوگا اس کا قرب پائے گا۔

کوئی اس پاک سے جو دل لگاوے
کرے پاک آپ کو تب اُس کو پاوے

دنیا کی بھی یہی رِیت ہے اچھوں کو اچھوں سے ہی تعلق ہوتا ہے اور بُروں کو بُروں سے۔ "کند ہم جنس باہم جنس پرواز" مشہور مقولہ ہے، حق تعالیٰ چونکہ حد سے زیادہ پاک ہے اس لیے اس سے تعلق کی یہ لازمی شرط ہے کہ اُس سے تعلق چاہنے والا خود کو پاک بنائے۔ اچھے اعمال اور تقویٰ یعنی بُرائی سے پرہیز ہی وہ ذریعہ

ہے جس سے انسان اس کی عالی بارگاہ تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ کیا یہ تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ ایک انسان جو غلاظت میں لت پت ہو اور جس کے قریب آتے ہی بدبُو سے ناک میں دم آئے ایک بادشاہ کے دربار میں رسائی حاصل کر کے اس کے قرب میں بیٹھ سکے، ایک بادشاہ تو الگ رہا ایک عام انسان بھی ایسے عفونت کے پُتلے کو اپنے قریب نہیں آنے دے گا اور جب یہ ممکن نہیں تو یہ بات سمجھنا کیا مشکل ہے کہ اعمال سیّئہ یعنی ایسے اعمال جو حق تعالےٰ کو ناپسند ہیں انسان کو اس کے قرب اور اس کے دیدار سے محروم کرتے ہیں اور اسی وجہ سے ان سے روکا گیا ہے۔

الغرض حق تعالےٰ کا قرب اور اس کا دیدار ہماری زندگی کا اصل مقصد ہے تا ہم اس کے حسن و جمال سے فیضیاب ہوں، لیکن حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ حق تعالےٰ کی محبت کا تو انکار کیا جاتا ہے لیکن اعمال جو محض اس کے قرب کا وسیلہ ہیں اُن کو ہی سب کچھ سمجھا جاتا ہے اور اتنی معمولی بات بھی منکرینِ محبتِ حق کو سمجھ نہیں آتی کہ جس سے پیار اور انس نہ ہو اس کے قرب کی بھلا کون ذیہوش کوشش کر سکتا ہے۔

اصل اللہ سے لگاوٹ ہے
ورنہ مذہب میں سب بناوٹ ہے

معلوم یوں دیتا ہے کہ جن لوگوں پر دُنیا کی محبّت غالب ہے اور جن کے نزدیک اصل شے دنیا کی حکومت اور سلطنت ہے انہوں نے اسلام کی غرض و غایت حکومت اور سلطنت کا قیام ہی سمجھ لیا ہے اور چونکہ اسلام کی مقرر کردہ عبادات انسان میں نظم و ضبط، محنت و جفاکشی یعنی وہ سب خوبیاں جو دنیوی ترقی کے لیے ضروری ہیں، پیدا کرتی ہیں۔ اس لیے ایسے لوگوں نے اسلامی عبادات کی غرض انہی خوبیوں کا حصول اور اس کے نتیجہ میں دنیوی اقتدار اور حکومت کا حاصل ہونا ہی قرار دے لیا ہے، لیکن ایسا کرتے ہوئے وہ یہ بھول گئے ہیں کہ یہ خوبیاں تو دنیا کی بہت سی قوموں نے بغیر اسلامی ریاضات کے اپنے اندر پیدا کیں اور عظیم الشان سلطنتیں قائم کی ہیں۔ بھلا برطانیہ سے بڑی دنیا میں کس کی سلطنت ہوئی کہ جس پر کبھی سورج ہی غروب نہیں ہوتا تھا اہل برطانیہ نے کون سی ریاضات کی تھیں کہ ان کو یہ اجر ملا؟ چونکہ اسلام کی بعثت کے بعد مسلمانوں کو خدائی وعدوں اور مدد کے ماتحت نہ کہ ان کے کسی زور بازو کے سبب وسیع فتوحات حاصل ہوئی تھیں (جیسے کہ قرآن مجید میں اس کی صراحت موجود ہے) لیکن بعد میں آنے والے لوگوں کی نگاہیں ان فتوحات سے خیرہ ہو کر ان میں ہی گم ہو کر رہ گئیں اور جن لوگوں کو یہ فتوحات دی گئی تھیں ان کے دلوں کی حالت تک نہ پہنچ سکیں۔ لیکن جو لوگ

روحِ اسلام سے واقف ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ رسول پاکؐ نے اپنے ماننے والوں کے دلوں میں عشقِ حق کا جھنڈا کس مضبوطی سے گاڑ رکھا تھا اور حضور پر ایمان لانے والوں کی دلی حالت کیا اور کیسی تھی ع

جو مسلمان تھا اللہ کا شیدائی تھا

اور ایسے کیوں نہ ہوتا جبکہ ساقیٔ کوثرؐ نے ان کو مئے حق کا جام لبالب پلا کر عشقِ حق میں ہی مست رہنے کا سبق پڑھایا تھا ؎

اسی کے سدا عشق کا دم بھرو تم
اسی کی طلب میں مرو گر مرو تم

انسان اگر غور کرے کہ اس کے پیدا کرنے میں آخر حق تعالےٰ کے مدِ نظر کیا حکمت تھی، تو دو باتیں صاف نظر آتی ہیں۔ پہلی یہ کہ چونکہ نیست سے ہست کرنا ایک بہت بڑا کمال ہے اس لیے انسان حق تعالےٰ کے کمال کے اظہار کے نتیجہ میں معرضِ وجود میں آیا ہے یعنی اگر وہ اسے پیدا نہ کرتا تو اس کے کمال کا تقاضا پورا نہ ہوتا، دوسرے یہ کہ حق تعالےٰ رحمٰن اور رحیم ہے اور اس کی ان صفات کی جلوہ گری کا یہ تقاضا تھا کہ کوئی وجود اس کے رحم و کرم کا مورد ہوتا۔ قرآن پاک میں حق تعالےٰ فرماتا ہے :-

اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَ لِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ (سورۃ ہود آیت ۱۲۰) سوائے اُن کے جن پر تیرے

رب نے رحم کیا ہے اور اسی (رحم کا مورد بنانے کے) لیے اس نے انہیں پیدا کیا ہے۔ چونکہ حق تعالےٰ کی صفتِ رحمت اس کی سب دیگر صفات کی طرح بے حد و بے انتہا ہے، اس لیے اس نے ہم خاک کے پُتلوں کو بنا کر اپنی ذات کو ہمارا نصب العین اور منتہا ٹھہرا دیا تاکہ اس کے کرم میں کسی کمی کا سوال باقی نہ رہے، اگر وہ اپنی ذات کے سوا سب کچھ جو زمین و آسمان کے اندر موجود ہے ہم کو بخش دیتا تو پھر بھی اس کی بخشش کے متعلق کہا جا سکتا تھا کہ اس سے زیادہ بخشش ابھی ممکن تھی یعنی اس کی اپنی ذات لیکن جب اس نے اپنی ذات کو ہمارا نصب العین ٹھہرا کر اپنے حسن و جمال سے بہرہ ور ہونا ہمارے لیے ممکن بنا دیا تو پھر اس سے زیادہ اور کیا بخشش ممکن ہو سکتی تھی کہ جس میں کسی کمی کا سوال باقی رہتا؟

اس درجہ ترقی خاک کو دی   وہ ہوش میں آکر شوق بنی
اس شوق کا خود منظورِ نظر   سبحان اللہ! سبحان اللہ

یہ کس قدر نادانی ہے کہ دنیا کی عارضی اور فانی اشیاء مثلاً اولاد، دولت، حکومت، جاہ و حشم، علم و ہنر وغیرہ کے لیے تو ہم اپنے دل میں بے پناہ محبّت رکھیں، لیکن ذات حق کی محبّت سے ہمارا سینہ خالی ہو؛ کیا یہ بات حد درجہ تعجب انگیز نہیں کہ ہم حق تعالےٰ کے قرب کی راہوں کو تو ظاہری اہمیت دیں پر اس کی اپنی

محبت کے منکر ہوں ۔ کیا اس صورت میں ہماری نمازیں محض جنبشِ اعضا، ہمارے روزے بے مقصد فاقے اور ہمارا حج بلا وجہ سفر کی صعوبت کے سوا اور کچھ ٹھہریں گے؟ ہمارے رسول پاکؐ اپنی نماز کو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیتے ہیں فرمایا قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ۔ اس حدیث پر غور کریں، کیا محض جسمانی قیام و قعود اور رکوع و سجود آنکھوں کی ٹھنڈک بن سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ سوز و گداز سے تہی نماز تو محض ایک چٹّی ہے، کیونکہ عبادت کا حقیقی جوہر عشق ہے، جس عبادت میں عشق کا عنصر نہ ہو، وہ عبادت نہیں بلکہ مزدوری اور محض اعضاء کی حرکت ہے۔

شوق تیرا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب

اور یحییٰ بن معاذؒ کا یہ قول کس قدر درست ہے کہ میرے نزدیک ایک رائی کے برابر محبّت ستّر برس کی اس عبادت سے بہتر ہے جو بغیر محبت کے ہو۔

پیشِ حق یک نالہ از روئے نیاز   بہ ز عمرِ بے نیاز اندر نماز

یعنی اللہ تعالےٰ کے حضور عاجزانہ گریہ وزاری اس زندگی سے بہتر ہے جو بغیر عاجزی کے نمازیں گذاری جائے۔

سیرت نبوی کی کوئی کتاب بھی اُٹھائیے اور حضور کی عبادات اور عشق الہٰی کا جو نقشہ نظر آتا ہے اس پر غور کیجیے۔

کیا حدیث شریف میں یہ نہیں آتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم جب نماز پڑھتے تو بعض اوقات شدّتِ گریہ کے سبب حضور انورؐ کے سینہ مبارک سے اس طرح کی آواز نکلتی جیسے کہ ہنڈیا آگ پر اُبل رہی ہو؟

کیا اب بھی منکرینِ محبّتِ الہٰی کو اصرار ہے کہ اس کا کوئی وجود نہیں اور س سے مراد صرف اطاعت ہے؟ حقیقت میں تو حضورؐ کی ساری زندگی ہی عشقِ الہٰی کی ایک تصویر تھی، بعثت سے قبل غارِ حرا میں جا کر اپنے پیدا کرنے والے کی عبادت کیا بغیر کسی جذبۂ عشق کے تھی اور اس وقت تک حضورؐ پر کوئی شریعت بھی نہ اُتری تھی کہ کہا جا سکے کہ اس کی مقرر کردہ عبادات بجالانے کے لیے حضورؐ ایسا کرتے تھے اور کیا کفار حضورؐ کی عشقِ الہٰی کی کیفیت دیکھ کر یہ نہ کہتے تھے کہ محمدؐ اپنے رب پر عاشق ہو گیا ہے۔

از شرابِ شوقِ جاناں بیخودے
در سرش برخاک بنہادہ سرے

یعنی آپ اللہ تعالےٰ کے عشق کی شراب سے مست تھے اور اسی کی دُھن میں سر بسجود رہتے تھے۔

اسلام دینِ فطرت ہے اور ہمارے رسول پاکؐ لَکُمْ فِی رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ[1] کے مطابق ہر جہت سے انسانوں کے لیے کامل نمونہ تھے۔ حق تعالےٰ سے بندے کے فطری تعلق اور محبت کے معاملہ میں بھی حضور کا کامل نمونہ ہونا ضروری تھا، اس لیے جیسے حضورؐ کے دُوسرے سب جوہر انتہائی بلندی کو پہنچے ہوئے تھے حضورؐ کا اپنے پیدا کرنے والے سے عشق بھی نقطۂ عروج پر تھا، بلکہ حضور کی ساری زندگی اس کی تفسیر تھی۔

حق تعالےٰ کی محبّت کا انکار کرنے والوں کی طرف سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کی طرف توجہ اور میلان انسان کی فاعلی قوتوں کو کمزور کرتا ہے، لیکن ایسا ہی اعتراض مذہب کے مخالفین مذہب پر بھی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مذہب لوگوں کو ایک طرح کی افیون کھلا کر سُلا دیتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ تو حق تعالےٰ کا سچّا عشق انسان کو نکمّا اور کاہل بنا کر حجروں اور خانقاہوں میں بٹھاتا ہے اور نہ ہی سچّا مذہب لوگوں کو افیون کھلا کر سُلاتا ہے، ہمارے رسول پاکؐ کی حیاتِ طیّبہ میں ان دونوں اعتراضات کا واضح اور روشن جواب موجود ہے۔ اگر دنیا میں کسی انسان نے اپنے پیدا کرنے والے سے حد درجہ کا عشق کیا ہے تو وہ محمد عربیؐ کا اپنے رب سے عشق تھا۔ لیکن کیا آپ کی زندگی عملِ پیہم اور جہد مسلسل کی ایک ایسی مثال نہیں کہ جس کی نظیر تاریخ عالم پیش کرنے سے یکسر قاصر ہے اور پھر جو مذہب آپ نے

---

[1] احزاب آیت ۲۱

دنیا کو دیا کیا اس نے مُردہ لوگوں کو زندہ نہ کر دیا؟

پھر انسان کو یہ بھی تو سوچنا چاہیئے کہ وہ کس قدر کمزور اور ناتواں ہے، کسی کو علم نہیں کہ کل جو دن چڑھنے والا ہے وہ کیسا ہوگا اور کیا لائے گا۔ طاقتور سے طاقتور انسان باوجود اپنی دولت اور جتھے کے حقیقت میں حد درجہ کمزور اور بے بس ہے، ہر انسان احتیاج کا پیکر اور حاجتوں کا ایک پلندہ ہے" یا قرآن کی اصطلاح میں فقیر ہے جیسے اس آیت میں ذکر ہے اَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ اِلَى اللّٰهِ (فاطر۔آیت ۱۶) یعنی انسان حد درجہ کمزور اور ناتوان ہے اور اس کی اسی حالت کو دیکھ کر کسی نے کہا ہے :۔

عالم ہمہ درد است و دوا می خواہد ازخوانِ کرم برگ و نوا می خواہد

کس بے حاجت نمی تواند دیدن درویش غذا شاہ اشتہا می خواہد

یعنی عالم سب درد ہے اور دوا چاہتا ہے اور اللہ تعالےٰ کے خوانِ کرم سے سب ضروری ساز و سامان چاہتا ہے کوئی شخص بھی نہیں جو ضرورتمند نہ ہو، درویش کو کھانے اور بادشاہ کو بھوک کی ضرورت ہے۔

اب ایک طرف تو ہماری انتہا سے زیادہ کمزوری اور بے بسی ہے اور دوسری طرف بے انتہا قدرتوں اور طاقتوں والا مہربان خالق ہے، لیکن ہم اس سے محبت اور تعلق کا انکار کرتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر بھلا ہماری اور کیا بدقسمتی ہو سکتی ہے کہ جس خزانۂ رحمت سے ہمارا تعلق فلاح دارین کا باعث بن سکتا ہے ہم اس سے محبت کے

مرے سے قائل ہی نہیں اور اتنا بھی نہیں سوچتے کہ اس ذات سے محبت تو
سراسر ہماری اپنی ہی فلاح کی ضامن ہے کیونکہ اس کا دامن تھام کر اس
کی پناہ میں آنے سے بڑھ کر ہماری اور کیا ہوشیاری ہو سکتی ہے ؎

پناہِ روئے تو جُستن نہ طورِ مستانیست
کہ آمدن بہ پناہت کمال ہشیاریست

یعنی تیری پناہ کو ڈھونڈنا دیوانوں کا طریقہ نہیں بلکہ تیری پناہ میں آنا ہی
کمال درجہ کی عقلمندی ہے۔

الغرض ہماری بے بسی اور ناتوانی پکار پکار کر ایک طاقتور پناہ کی
طلب گار ہے اور یہ ہماری حد سے زیادہ خوش قسمتی ہے کہ حق تعالیٰ
کی ذات پاک میں وہ پناہ ہم کو میسّر ہے اور پھر پناہ بھی ایسی کہ اگر
ہم چل کر اس کی طرف جائیں تو وہ دوڑ کر ہمیں اپنی آغوش میں لے اور
نہ صرف یہ بلکہ اپنے جوار رحمت میں آنے کے لیے ہمیں خود ہی زور سے
تلقین فرمائے جیسے کہ قرآن پاک میں اس کا ارشاد ہے: فَفِرُّوْٓا اِلَی اللّٰہِ۔
(الذریات) اسی طرح آتا ہے وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ[1]۔ اور ظاہر ہے کہ
عجز اور تذلّل کے سوا حق تعالیٰ کی بارگاہ میں کسی شے کی کمی نہیں،
اس لیے اگر ہم محبت بھرے دل سے اپنی عاجزی اور خاکساری کا حقیر
تحفہ لے کر اس کی عالی بارگاہ میں جائیں گے تو یہ قابل قبول ہو گا اور
اس کا ابر کرم ہم پر برسے گا:۔

---

[1] آل عمران آیت ۱۳۴۔

زمیں کی طرح جس نے عاجزی و خاکساری کی
خدا کی رحمتوں نے اس کو ڈھانپا آسماں ہو کر

اور ہماری عاجزی اور خاکساری کے ساتھ اگر ہماری گریہ و زاری بھی شامل ہو جائے تو رحمتِ خداوندی کو اس سے بڑھ کر جذب کرنے والی دنیا میں اور کوئی شے نہیں :-

اے خنک چشمیکہ او گریانِ اُو
وے ہمایوں دِل کہ اُو بریانِ اُو
ہر کجا آبِ رواں سبزہ بود
ہر کجا اشکِ رواں رحمت بود
باش چوں دولابِ نالاں چشم تر
تا زصحنِ جانت بر روید خضر

یعنی وہ آنکھ ٹھنڈی رہے جو اس محبوب حقیقی کے لیے روتی ہے اور وہ دل مبارک ہے جو اس کی سوزشِ عشق سے بریاں ہے ۔ قاعدہ یہ ہے کہ جہاں آب رواں ہو وہاں سبزہ اُگ پڑتا ہے۔ اسی طرح جہاں آنسو بہتے ہوں وہاں اللہ کی رحمت کا باغ لہلہانے لگتا ہے ۔ تم رہٹ کی طرح نالاں اور چشم تر ہو جاؤ تاکہ تمہارے صحنِ جان میں سبزہ پیدا ہو جائے۔

"ہمارا خالق" پر بعض آرا

- "ماشاء اللہ بہت خوب ہے۔" چودھری محمد علی، سابق وزیر اعظم پاکستان
- "مَیں نے کتاب کو بصیرت افروز پایا ہے، نوجوان نسل کے لیے بہت مفید ہے۔"
  ایس اے رحمان، سابق چیف جسٹس آف پاکستان
- "کتاب نہایت اچھی لکھی گئی ہے۔" (ممتاز حسن، سابق گورنر سٹیٹ بنک آف پاکستان)
- "ماشاء اللہ خوب چیز ہے۔ مطالب، کتابت ہر لحاظ سے خوب ہے۔"
  میاں عبدالرشید، ناظمِ اعلیٰ مجلسِ تعمیرِ فکر و کردار
- "آپ نے اسلام کے خُدا کا تصوّر بہت خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے۔ کتاب کے ایک ایک صفحے سے معرفت کی خوشبو آتی ہے۔ مَیں نے کتاب کو غور و خوض سے پڑھا ہے بلکہ صحیح تو یہ ہے کہ پڑھتا رہتا ہوں۔ آپ نے بہت عرق ریزی سے ماڈرن علم کی روشنی میں اپنے موضوع پر بیش بہا معلومات کا ذخیرہ یکجا فراہم کر دیا ہے۔" میاں محمد شفیع (م۔ش)
- "ہمارا خالق، نہایت اچھی تصنیف ہے۔" سیّد نذیر نیازی
- "ہماری نئی نسل میں سے بعض لوگوں کو اشتراکیت کے عقاب اُچک رہے ہیں یا مکرِ مغرب کی تند اور تیز آندھیاں انھیں اپنی منزل سے بہت دُور پھینک رہی ہیں، آپ کی کتاب نسلِ نو کو اس افتاد سے بچانے کی ایک اچھی کوشش ہے۔"
  ڈاکٹر غلام جیلانی برق
- "شروع سے آخر تک کتاب [illegible] مجھے منہمک رکھا۔ قرآن میرے لیے [illegible] سے ظاہر ہُوا ہے۔ یہ کتاب [illegible] مدح میں ایک بَجن ہے اور مَیں اس [illegible] ہُوا ہوں۔" (انگریزی خط [illegible]) گوستاف ڈی سرڈی۔ [illegible]
- "انگریزی زبان میں کتا[illegible] رجمہ پر مبارک قبول فرمائیں۔ مَیں نے [illegible] پر ساتھ دیے جانے کے [illegible] قیمتی کتاب کا انتخاب کیا ہے۔" (انگریزی [illegible])
  نوح سیونڈبیس، کوپن ہیگن (ڈنمارک)